يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

وہ تمہارے پاس بہانے لائیں گے جب تم لوٹ کر ان کی طرف جاؤ گے کہہ بہانے مت بناؤ ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے۔ اللہ نے تمہارے حالات کی خبر ہمیں دے دی ہے اور اللہ اور اس کا رسول تمہارے عمل کو دیکھے گا، پھر تم غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمہیں خبر دے گا جو تم کرتے تھے۔ (1336)

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۖ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

وہ تمہارے پاس اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم ان کی طرف واپس جاؤ گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو، سو ان سے درگزر کرو وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے۔ (1337)

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

وہ تمہارے پاس قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ سو اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔

---

1336 - چونکہ ان آیات کا نزول سفر تبوک میں ہوا اس لیے پہلے باطل عذروں کے ساتھ جو اجازت کے لیے ان لوگوں نے کیے تھے جن کا ذکر ﴿جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ﴾ [90] میں ہے یہاں ان عذروں کا ذکر کیا ہے جو جنگ سے واپسی کے بعد پھر یہ لوگ کریں گے۔ پہلی دفعہ یہ عذر قبول کر لیے گئے اب فرمایا کہ کہہ دو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے تمہارے معاملہ پر روشنی ڈالی ہے اور تمہارا فیصلہ کر دیا ہے اس لیے اب عذر بے سود ہے۔

1337 - **منافقوں سے اعراض:** ان کی قسمیں کھانے کی غرض یہ بتائی کہ مسلمان ان سے اعراض کریں یعنی ان کو ان کی کمزوریوں پر ملامت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ان سے اعراض ہی کرو یعنی کسی قسم کا تعلق نہ رکھو اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ ناپاک ہیں یعنی ان کے خیالات ناپاک ہیں، وسوسہ اندازی ان کا کام ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

دیہاتی کفر اور نفاق میں بڑے سخت ہیں اور اسی کے زیادہ لائق ہیں کہ اس کی حدوں کو نہ جانیں جو اللہ نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ (1338)

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اسے چٹی سمجھتے ہیں اور تم پر زمانہ کی گردشوں کی تاک میں رہتے ہیں بری گردش انہی پر پڑے گی اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (1339)

---

1338 - اَجْدَرُ۔ جَدِيْرٌ ایک چیز کا منتہی ہے یعنی جس کی طرف ایک امر کا انتہا ہو جس طرح جِدَارٌ یعنی دیوار کی طرف ایک امر کا انتہا ہو جاتا ہے اور جِدَارٌ دیوار کو بلحاظ اس کی بلندی کے کہا جاتا ہے اور حَائِطٌ احاطہ کرنے کے لحاظ سے ﴿جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ﴾ [الکھف: 77:18] ''ایک دیوار جو گرا چاہتی تھی۔'' جمع جُدُرٌ ہے ﴿اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾[الحشر: 14:59] ''یا دیواروں کی آڑ میں۔'' اور اس لیے جَدِيْرٌ کے معنی ہیں گویا وہ اسی چیز کے لیے بنائے گئے ہیں۔

یہ قرآن شریف کا کمال تھا کہ ایسے سخت لوگوں کو بھی جو علم سے اس قدر دور تھے کہ حدود اللہ کا علم حاصل کرنے کے لیے گویا پیدا ہی نہیں ہوئے ان کو بھی حدود اللہ پر قائم کر دکھایا۔ اعراب کے اس نقشہ میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ دنیا کی کوئی قوم نہیں جس کی اصلاح قرآن شریف نہیں کر سکتا۔

1339 - مَغْرَمًا۔ غَرَمٌ وہ ہے جو انسان کو اس کے مال میں نقصان پہنچے۔ حالانکہ اس کا اپنا کوئی ایسا فعل نہیں نہ خیانت ہے۔ یہاں اور ﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ﴾ [الواقعة: 66:56] ''(کہ) ہم پر چٹی پڑ گئی۔'' میں چٹی مراد ہے اور قرض دار کو غارم یا غریم کہا جاتا ہے ﴿وَالْغٰرِمِيْنَ﴾ [60] ''اور قرض داروں (کے لیے)۔'' اور غرام اس شدت اور مصیبت کو کہا جاتا ہے جو انسان پر آ پڑے گویا وہ اس سے ایسا چمٹ جاتا ہے جیسے فریم۔ ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾[الفرقان: 65:25] ''کیونکہ اس کا عذاب بھاری مصیبت ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کو ظاہر داری کے لیے کچھ مال خرچ کرنا پڑتا تھا اسے وہ **چٹی سمجھتے تھے**۔ بہتیرے مسلمان جو آج کچھ دینی کاموں میں خرچ کرتے ہیں اسے چٹی سمجھتے ہیں۔ قرآن نہیں پڑھتے کہ ان کو معلوم ہو کہ وہ صحابہ کے نقش قدم پر نہیں چلتے اور منافقین کا خرچ کیے ہوئے مال کو چٹی سمجھنا اس وجہ سے تھا جیسا کہ خود بتایا کہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان ہلاک ہو جائیں گے۔ یہ نویں سال ہجرت کی آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک بھی مخالفین کو یہ امید لگی ہوئی تھی کہ مسلمان

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ع 12 10 1

اور بعض گاؤں والے ایسے بھی ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قرب اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ ٹھہراتے ہیں، سنو وہ ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1340)

---

تباہ ہو جائیں گے اس لیے اسلام میں داخل ہونا کسی لالچ کی بنا پر نہ ہو سکتا تھا۔

1340 - قُرُبٰتٍ۔ قُرْبَةٌ کی جمع ہے۔ ہر ایک قدم جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتا ہے قُرْبَةٌ ہے اور **اللہ تعالیٰ کا قرب بندہ پر** فیض اور افضال سے ہے، نہ مکان سے۔ اور قُرْبٌ اصل میں یہ ہے کہ بہت سی وہ صفات جو اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں ان سے بندہ مخصوص ہو گو اس حد تک وہ صفات اس میں نہ پائی جائیں، جس حد تک اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے حکمت اور علم اور حلم اور رحمت اور غنا اور یہ تب ہوتا ہے جب پہلے انسان جہل اور طیش اور غضب وغیرہ بری صفات سے پاک ہو۔ (غ)

صَلَوٰتِ۔ صَلٰوةٌ کی جمع ہے جس کے اصل معنی دعا ہیں، [دیکھو نمبر: 12]۔ یہی معنی یہاں مراد ہیں۔

## قرآن کریم کا پیدا کردہ انقلاب:

یہاں نہ صرف ایک حق بات کو ظاہر کیا کہ اعراب میں یا دیہاتیوں میں اگر سخت لوگ ہیں تو اچھے بھی ہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ کس طرح قرآن کریم کی بدولت ایک قوم ایک ایسے ذلیل مقام سے جس پر عرب کے دیہاتی تھے بلند مقام پر ترقی کر گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا حاصل کرنا ان لوگوں کی غرض ہو گئی۔ گویا کوئی دنیوی غرض نہیں کہ اس طرح مال خرچ کرنے سے حکومت اور سلطنت مل جائے گی بلکہ محض قرب الٰہی کا حصول غرض ہے۔ یہ فی الواقع بڑا ہی بلند مقام ہے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو قرب الٰہی کے حصول کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہاں حکومت اور سلطنت کے حصول کے لیے بہتیرے اپنے مال دینے کو تیار ہیں۔ کاش مسلمانوں کے لیڈر اس بات پر غور کر کے قوم کو صحیح راہ پر ڈالیں۔ ﴿صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ﴾ کا لفظ یہاں لا کر یہ بتایا ہے کہ گناہوں کے پاک کرنے میں رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں نے بھی ایک عظیم الشان کام کیا ہے اور قرب الٰہی آپ کی دعا کے بغیر میسر نہیں آ سکتا۔ **آپ کی یہ قوت قدسی اور یہ دعا اور توجہ اب بھی کام کرتی ہے**۔ جو لوگ پیروں کے پیچھے پڑ کر ان کو ﴿اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: 64:3] ''اللہ کے سوا رب بنائے'' بنا رہے ہیں اور اپنے اموال کو ان کی نذروں نیازوں میں تباہ کرتے ہیں۔ اگر یہی اموال دین اسلام کی ترقی کے لیے خرچ کرتے تو رسول اللہ ﷺ کی دعا ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے قرب کے مقام پر پہنچا دیتی۔ مگر یہ افسوس کا مقام ہے کہ ایک طرف یہ لوگ اپنے اموال کو برباد کرتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے بھی روز بروز دور پڑتے چلے جاتے ہیں۔ رسول کے دین کی ترقی میں جو شخص کوشاں ہو گا وہ یقیناً

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰

اور پہلے سبقت لے جانے والے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ جنہوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، اور اس نے ان کے لیے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ انہی میں ہمیشہ رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔[1341]

---

قرب الٰہی کے حصول میں ترقی کرے گا۔ یہی وہ طریق ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو چلایا اور یہی ہم کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں کام کرتا نظر آتا ہے۔ ایک بھی مثال ایسی نہیں کہ صحابہ میں کوئی **پیر بن کر لوگوں کا مال نذر و نیاز کے رنگ میں کھاتا ہو۔**

1341- سٰبِقُوْنَ۔ سَبَقَ کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھنا ہیں۔ اور اِستِبَاق ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ﴿اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ﴾ [یوسف: 17:12] ''ہم ایک دوسرے سے آگے نکلتے ہوئے چلے گئے۔'' ﴿وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ﴾ [یوسف: 25:12] ''اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے۔'' اور پھر ہر قسم کے تقدم پر بولا جاتا ہے۔ ﴿مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ﴾ [الأحقاف: 11:46] ''وہ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔'' اور ﴿كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ [یونس: 19:10] ''ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ ہو چکی ہوتی۔'' میں مراد نفوذ یا پہلے ہو چکنا ہے اور فضیلت اور بزرگی کے حاصل کرنے پر بولا جاتا ہے ﴿السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ﴾ [الواقعة: 10:56] ''آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہی ہیں۔'' سے مراد اعمال صالحہ سے ثواب اور جنت کی طرف پہلے جانے والے ہیں۔ گویا یہ ﴿يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾ [آل عمران: 114:3] ''نیکیوں کو جلدی لیتے ہیں۔'' کے قائمقام ہے ﴿وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾ [المؤمنون: 61:23] ''اور وہ ان کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔'' میں یہی مراد ہے اور ﴿وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ﴾ [الواقعة: 60:56] میں مراد یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل نہیں سکتے۔ ایسا ہی ﴿وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا﴾ [الأنفال: 59:8] ''اور جو کافر ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ آگے نکل گئے۔''

اَوَّلُوْنَ۔ اَوَّلٌ سے ہے جس کے معنی ہیں اصل کی طرف رجوع کرنا۔ اور اول وہ ہے جس پر اس کا غیر مترتب ہو۔ اور اول ہونا کئی لحاظ سے ہو سکتا ہے جیسے زمانہ کے لحاظ سے جو عام ہے یا ریاست اور مرتبہ کے لحاظ سے جیسے اول امیر ہے پیچھے وزیر وغیرہ اور ﴿اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الأنعام: 163:6] ''میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔'' ﴿اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الأعراف: 143:7] ''سب سے پہلے ایمان لانے والا۔'' میں مراد یہ ہے کہ اسلام اور ایمان میں دوسروں کو میرا اقتدا کرنا چاہیے اور ﴿لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾ [البقرة: 41:2] میں بھی یہی مراد ہے کہ ایسے کافر مت بنو جو دوسرے تمہارا اقتدا کریں۔

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى

اور بعض تمہارے اردگرد کے دیہاتیوں میں سے منافق ہیں اور بعض مدینے کے رہنے والے بھی نفاق پر اڑے

مع 5 وقف منزل

---

مُهٰجِرِيْنَ۔ مُهَاجِرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 280]۔ مہاجرین اصطلاح اسلام میں وہ لوگ ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ کے اتباع کی وجہ سے اپنے وطن چھوڑنے پڑے۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد عموماً ترک وطن کی ضرورت نہ رہی۔

اَنْصَارِ۔ نَصِيْرٌ کے معنی ناصر یا مددکرنے والا اور اس کی جمع انصار ہے۔ مگر اصحاب نبی ﷺ کے ایک گروہ کے لیے یہ خاص نام ہوگیا ہے، جیسے ایک قبیلہ کا نام ہوتا ہے۔ (ل) اور یہ اہل مدینہ کا وہ گروہ ہے جن کی وجہ سے دین اسلام کو وہ عظیم الشان نصرت ملی کہ سب مسلمان ہجرت کر کے وہاں چلے گئے۔

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ اللہ کی رضا بندہ سے یہ ہے کہ وہ اسے اپنے اوامر کی تعمیل کرتا ہوا اور اپنی نہیوں سے رکتا ہوا پائے اور بندہ کی رضا اللہ سے یہ ہے کہ جو کچھ اس کی قضاوقدر سے اس پر وارد ہوا سے ناپسند نہ کرے۔ (غ)

اصل ذکر تو اس رکوع میں انہی لوگوں کا ہے جن سے کوئی کمزوریاں سرزد ہوئیں یا جو منافق تھے۔ لیکن چونکہ پچھلے رکوع کے آخر میں اعراب کے اس گروہ کا ذکر آیا تھا جو اللہ تعالیٰ کا قرب چاہنے کے لیے اپنے مال خرچ کرتے تھے۔ اس لیے یہاں ان کامل مومنین کے گروہ کا ذکر بھی کیا جو دوسرے مسلمانوں کے لیے بطور مقتدا ٹھہرے اور یہ گروہ مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین کا ہے۔ سَابِقُوْنَ اَوَّلُوْنَ سے کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا وہ جنہوں نے دوقبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ بعض نے کہا اہل بدر۔ بعض نے اہل بیعت رضوان۔ بعض نے کہا جو ہجرت سے پہلے ایمان لائے اور انصار میں سے سابق اول اہل بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ کو کہا ہے۔ لیکن اکثر اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد کل مہاجرین اور انصار ہیں۔ اور سابق اول ہونا بلحاظ دوسرے مسلمانوں کے ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سابق اور اول ہونے میں گو زمانہ کو بھی خاص دخل حاصل ہے اس لیے کہ جس قدر زیادہ مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اسی قدر زیادہ کمال ایمان بھی ان لوگوں کو حاصل ہوا اور جو لوگ پہلے ایمان لائے ان میں سے اکثر نے بہت بڑی بڑی ترقیاں کیں۔ مگر سابق اور اول سے اصل مراد جیسا کہ ان الفاظ کی تشریح میں دکھایا گیا ہے اعمال صالحہ کے لحاظ سے سابق ہونا اور دوسروں کے لیے مقتدا ہونے کے لحاظ سے اول ہونا ہے۔ یوں بلحاظ زمانہ عبیداللہ مہاجرین اولین میں سے تھا مگر نصرانی ہوگیا۔ اس لیے حقیقتاً ﴿السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ بلحاظ زمانہ نہیں بلحاظ اعمال ہیں۔ اسی لیے جب ان کے اتباع کا ذکر کیا تو باحسان کا لفظ بڑھایا، یا نیکیوں میں ان کی اتباع کرنے والے۔ گویا ان کا تقدم اور ان کی سبقت نیکیوں کے لینے میں تھی۔ یہ سابقین مقربین بارگاہ الٰہی ہیں ﴿وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ﴾ [الواقعة: 10:56-11] ''اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہی ہیں۔ وہی مقرب ہیں۔'' اور جنہوں نے احسان میں ان کی پیروی کی ان کو بھی ان کے ساتھ یہ مرتبہ ملا کہ **اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اور یہ بلند ترین مقام ہے جس پر انسان پہنچ سکتا ہے**۔ اور فی الحقیقت جو کمال صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ کے اوامر ونواہی کی تعمیل میں دکھایا اس کی نظیر دنیا دکھانے سے عاجز

النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ﴿۱۰۱﴾

بیٹھے ہیں۔تو ان کو نہیں جانتا ہم انہیں جانتے ہیں ہم ان کو دوبار عذاب دیں گے پھر وہ بھاری عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔(1342)

---

ہے۔قرآن کریم میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا جس کی تعمیل انہوں نے لفظاً نہیں کر دکھائی اور پھر اللہ تعالیٰ کے قضا وقدر پر ایسے راضی ہوئے کہ سر دے کر، جان دے کر، مال دے کر، اولاد دے کر خوش ہوتے تھے۔

1342- مَرَدُوْا۔ مارِدٌ اور مَرِیْدٌ کے معنی راغب نے کیے ہیں خیرات سے خالی اور اسی سے اَمرَدْ وہ ہے جس کی ڈاڑھی کے بال ابھی نہ نکلے ہوں اور حدیث میں جو ہے [اَهْلُ الْجَنَّةِ مَرَدٌ] تو اس کے معنی یہ کیے گئے ہیں کہ وہ برائیوں اور عیبوں سے خالی ہوں گے اور ﴿مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾ کے معنی ہیں [اَرْتَكَسُوْا عَنِ الْخَيْرِ وَ هُمْ عَلَى النِّفَاقِ] یعنی نیکی سے محروم رہ گئے درآنحالیکہ وہ نفاق پر تھے۔(غ) اور مَرَدَ کے معنی مَرَنَ بھی ہیں یعنی عادی ہو گیا اور [مَرَدَ عَلَى الشَّرِّ] کے معنی ہیں [عَتَا وَ طَغٰى] یعنی سرکشی کی اور حد سے بڑھ گیا۔(ل)

## منافقین کی سزا:

چونکہ اصل ذکر اعراب یعنی بادیہ نشین منافقین کا چل رہا تھا۔اس لیے اسی مضمون کی طرف رجوع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان میں سے تو منافق ہیں مگر اہل مدینہ میں سے جو شہری لوگ ہیں وہ نفاق پر سخت اڑے بیٹھے ہیں۔ان کا نفاق اس وقت سے شروع ہوا جب نبی کریم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے اور اب نویں سال تک انہوں نے اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تھی۔اور گو ان کے عمل سے ان کی حالت ظاہر تھی مگر تاہم یہ لوگ اس قدر چالاک تھے کہ مسلمانوں کے سامنے قسمیں کھا کھا کر اپنا مومن ہونا ظاہر کرتے تھے ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ [المنافقون: 2:63] ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔'' اس لیے فرمایا کہ تم انہیں نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔اور ''ہم جانتے ہیں'' میں یہ اشارہ ہے کہ ہم اب تمہیں ان کے نام بتاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جنہیں مسجد سے نکال دیا گیا اور ان کی سزا بتائی کہ **دو دفعہ ان کو عذاب دیں گے**، پھر عذاب عظیم کی طرف لوٹائے جائیں گے۔عذاب عظیم آخرت کا عذاب ہے اس لیے دو دفعہ کا عذاب اس دنیا میں ہونا چاہیے۔اکثر مفسرین نے اس دو دفعہ میں عذاب قبر کو شامل کیا ہے۔حالانکہ عذاب قبر عذاب آخرت میں شامل ہے اور وہ منافقوں سے خاص نہیں۔اور ایک عذاب پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خطبہ جمعہ میں ان منافقوں کے نام لے کر ان کو مسجد سے نکال دیا یہ ان کی رسوائی ان کے لیے واقعی سخت عذاب کا موجب تھی۔اس لیے کہ اب تک وہ اپنی منافقت کی جھوٹی قسمیں کھا کر چھپاتے تھے، اب وہ سب پردہ فاش ہو گیا۔اور دوسرے عذاب پر قرآن کریم اپنی نص صریح سے شاہد ہے ﴿وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا﴾ [85] ان منافقوں کے مال اور اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں۔اللہ چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ انہیں دنیا میں عذاب دے اور یہ یوں عذاب کا موجب تھا کہ ان کی اولاد ان کی

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

اور کچھ اور ہیں جنہوں نے اپنے قصور مان لیے ایک نیک کام اور دوسرا برا ملایا، قریب ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔[1343]

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ

ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے لے تاکہ اس سے تو انہیں پاک اور صاف کرے اور ان کے لیے دعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے اور

---

آنکھوں کے سامنے مسلمان بنی اور اسلام کی تائید اور نصرت میں اپنی جانوں تک دیتے تھے اور ان کو مال بھی ظاہر داری کے لیے اسلام کی تائید میں خرچ کرنے پڑتے تھے جیسا کہ [آیت نمبر: 98] سے ظاہر ہے۔ جہاں فرمایا کہ وہ اس خرچ کو چٹی سمجھتے ہیں۔ دل سے تو اسلام کے دشمن تھے اور اسلام کی تباہی چاہتے تھے اور ان کے مال اور اولاد اسلام کی تائید میں خرچ ہو رہے تھے۔ اس سے بڑھ کر عذاب کیا ہو سکتا تھا۔ پس یہی دو عذاب دنیا تھے۔

1343 - اعْتَرَفُوْ۔ عَرَفَ کے معنی پہچانا یا جان لیا۔ اور اِعتَرَف کے معنی اقرار کیا اور اصل اس کا گناہ کی معرفت کا اظہار ہے جو جحو دکی ضد ہے۔ (غ) اور اِعْتَرَفَ بمعنی عَرَفَ بھی آتا ہے۔ (ل) اور اعتراف ذنب کے لازماً یہ معنی نہیں کہ گناہ کر کے دوسروں پر ظاہر کرتا پھرے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک شخص نے آ کر اپنے کسی گناہ کو ظاہر کیا تھا تو آپ نے منہ پھیر لیا اور دو دفعہ اسی طرح کیا گویا اس کو پسند نہیں کیا۔ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے [اَطْرَدْنَا الْمُعْتَرِفِيْنَ] یعنی جو لوگ ان باتوں کو جن میں حد اور تعزیر واجب ہے خود ظاہر کرتے ہیں ہم ان کو شہر سے نکال دیں گے گویا اسے ناپسند کیا (ل) اصل اعتراف ذنب یہ ہے کہ انسان کا اپنا نفس یہ محسوس کرے کہ اس سے ایک برا فعل سرزد ہوا ہے اور اس کے ازالہ کی کوشش کرے یہی اقرار ہے۔

### منافقوں کی توبہ:

مفسرین نے یہاں ابولبابہ اور بعض دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ سب بطور مثال ہے۔ قرآن کریم نے منافقوں کے ذکر کو یہاں ہر پہلو سے پورا کر دیا ہے۔ چونکہ یہاں منافقوں کی سزا کا ذکر تھا اور اوپر ان منافقوں کا ذکر ہوا جو نفاق پر اڑ گئے اور ان کی فضیحت کا ذکر تھا تو اب ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخت دشمن اسلام نہ تھے یا کمزوری کی وجہ سے منافقین سے ملے ہوئے تھے اور سوائے ان تھوڑوں کے جن کے نام لے کر انہیں مسجد سے نکالا گیا بڑا حصہ منافقوں کا ایسا ہی تھا جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے اور ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ﴾ میں جو امید دلائی ہے وہ ان کے حق میں پوری ہوئی۔

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(1344)

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور زکوٰۃ لے لیتا ہے اور کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(1345)

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور کہہ عمل کرو اللہ تمہارے عمل دیکھے گا اور اس کا رسول اور مومن بھی۔ اور تم غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، سو وہ تمہیں خبر دے گا جو تم عمل کرتے تھے۔(1346)

---

1344 - ﴿تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ﴾۔ **تَطْهِيْرٌ اور تَزْكِيَةٌ میں فرق** یہ ہے کہ طُهْرٌ نجاست کا نقیض ہے اور تَطْهِيْرٌ کے معنی نجاست سے پاک کرنا ہیں اور تَزْكِيَةٌ کا اصل زکا ہے جو نمو پر بولا جاتا ہے اور اس لیے تَزْكِيَةٌ کے معنی ہیں خیرات اور برکات سے نفس کو ترقی دینا۔ پس تطہیر صرف برائیوں سے پاک کرنا ہے اور تزکیہ نیکیوں میں ترقی کرنا۔

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ میں یہاں صرف دعا مراد ہے یعنی ان کے لیے استغفار کرو، نماز جنازہ مراد نہیں۔

**توبہ کرنے والے منافقوں سے زکوٰۃ کا لینا اور مسلمانوں کے لیے سبق:**

یہاں رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دے کر کہ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے لو یہ بھی بتا دیا کہ [آیت نمبر:101] کے منافقوں سے جنہیں مسجد سے نکال دیا گیا زکوٰۃ نہیں لینی چاہیے جو مسلمان زکوٰۃ ادا نہیں کرتے وہ غور کریں کہ ان کا حشر کس گروہ میں ہوگا۔ نام کا مسلمان کہلانا کوئی فائدہ نہ دے گا۔ جس طرح منافقوں کو فائدہ نہ دیا۔ پھر اس زکوٰۃ لینے کا فائدہ یہ بتایا کہ اس سے ان کی تطہیر اور ان کا تزکیہ ہوگا یعنی جو گناہ کر چکے ہیں ان سے پاک ہوں گے اور آئندہ نیکیوں میں ترقی کریں گے اور نبی کریم ﷺ کو ان کے لیے دعا کا حکم دیا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جب زکوٰۃ کا مال آتا تو آپ دینے والے کے لیے دعا کرتے اور اسی طرح جو امام ہو اس پر واجب ہے۔ دعا کو دوسروں کے لیے موجب تسکین فرمایا ہے۔

1345 - ﴿يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ﴾ اَخَذٌ کے معنی لے لینا ہیں لیکن یہاں اللہ تعالیٰ کا صدقات کو لینا استعارۃً بمعنی قبولیت ہے۔

1346 - اللہ تعالیٰ تو اعمال کو دیکھتا ہی ہے مطلب یہ ہے کہ تمہیں آئندہ اپنے صدق اور اخلاص کا ثبوت دینا ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾ [الفتح: 16:48] ''پیچھے رہے

وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اور کچھ اور اللہ کے حکم کے لیے پیچھے رکھے گئے ہیں یا انہیں عذاب دے اور یا ان کی توبہ قبول کرے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (1347)

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور (کچھ وہ ہیں) جنہوں نے ضرر اور کفر اور مومنوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مسجد بنائی اور اس شخص کے لیے گھات جس نے پہلے سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کی اور وہ یقیناً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ سوائے بھلائی کے کچھ نہ تھا اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ (1348)

---

ہوئے دیہاتیوں سے کہہ دے کہ تم ایک سخت جنگ کرنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے، ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ فرمانبردار ہو جائیں۔'' اور چونکہ یہاں بھی پیچھے فرمایا تھا کہ آئندہ یہ منافق جنگ میں ساتھ نہ نکلیں [83] اس لیے جنہوں نے توبہ کی ان کو پھر موقعہ ملتا ہے کہ اسلام کے لیے اپنے صدق اور اخلاص کو دشمن کے مقابلہ میں نکل کر دکھائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اور مومنوں کا لفظ بڑھایا ہے یعنی وہ اس قسم کے عمل ہوں گے جن کو رسول اور مومن بھی دیکھ سکتے ہیں اور وہ جنگوں میں نکلنا ہے۔ آج بھی مسلمان اپنے اخلاص کا ثبوت اسی طرح دے سکتے ہیں کہ خدا کی راہ میں اور اس کے دین کی ترقی کے لیے اپنے مالوں کو بے دریغ خرچ کریں اور اپنی جانیں دے دیں۔

1347 - مُرْجَوْنَ۔ [اَرجَا الْاَمْرَ] کے معنی ہیں اَخَّرَهُ یعنی اسے پیچھے ڈال دیا اور ہمزہ ترک بھی کر دیا جاتا ہے۔ (ل)

## منافقین سے تشابہ:

یہ کون تھے؟ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ وغیرہ اسی طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد وہی تین شخص ہیں جن کا ذکر [آیت نمبر: 118] میں ہے۔ مگر اس رکوع میں منافقین کا ذکر ہے اور ان تین کا ذکر آگے چل کر مومنوں کی ذیل میں بھی کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان تینوں نے غزوہ تبوک میں شمولیت پر اپنے آرام کو مقدم کیا اور یوں منافقوں کے ساتھ خود تشبیہ پیدا کر لی۔ اس لحاظ سے ان کا ذکر یہاں کیا اور ان کی توبہ کا ذکر مومنوں کی ذیل میں کیا تا کہ یہ معلوم ہو کہ وہ فی الواقع منافقین میں شامل نہ تھے۔

1348 - اس آیت میں منافقوں کے اس گروہ کا ذکر ہے جنہوں نے وہ مسجد بنائی جو **مسجد ضرار** کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بارہ آدمی تھے جنہوں نے ابو عامر راہب کی سازش سے ایک مسجد قبا کے پاس بنائی۔ **ابو عامر** خزرج میں سے ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اس میں کبھی کھڑا نہ ہو یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے کہ تو اس میں کھڑا ہو اس میں ایسے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ پاک رہیں اور اللہ پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (1349)

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ

تو کیا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ

---

عیسائی ہوگیا اور بوجہ اس کی عبادت کے خزرج اس کی عزت کرتے تھے۔ جب بدر میں رسول اللہ ﷺ کو فتح ہوئی تو ابو عامر بھاگ کر قریش سے جاملا اور ان کو رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے اکسایا اور احد میں خود بھی آیا اور انصار کو ورغلانا چاہا مگر نامراد رہا۔ آخر جب رسول اللہ ﷺ کے امر کو غالب ہوتے دیکھا تو ملک شام میں چلا گیا تاکہ ہرقل سے رسول اللہ ﷺ کے خلاف مدد لے اور وہاں سے کچھ وعدہ پاکر اپنی قوم کے بعض آدمیوں کو خط لکھا کہ وہاں ایک علیحدہ مسجد بنائیں جہاں منصوبہ بازی کا کام آسانی سے ہوسکے۔ اسی بنا پر یہ مسجد بننی شروع ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ تبوک کے لیے تیار تھے جب یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے کہ آپ اس میں نماز پڑھیں۔ آپ نے فرمایا سفر سے واپسی پر دیکھا جائے گا۔ واپسی پر مدینہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وحی کے ذریعہ سے اصل حقیقت سے آپ کو اطلاع دی اور آپ نے اس مسجد کو گروادیا۔ اس کے بنانے کی اول غرض ضِرَارًا فرمائی یعنی مسلمانوں کو ایذا پہنچانا، سو ظاہر ہے۔ **دوسری غرض** کفر کا پھیلانا وہ بھی ظاہر ہے تیسری ﴿تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جس سے مراد یہ ہے کہ الگ مسجد بنانے کی غرض مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا تھا تاکہ بعض لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنے ساتھ ملالیں اور ﴿اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ سے مراد ابو عامر کے لیے گھات ہے۔ کیونکہ غرض یہ تھی کہ ابو عامر اس مسجد کے ذریعہ سے رسول اللہ ﷺ کے حالات سے آگاہی وغیرہ حاصل کرتا رہے۔ جس سے آپ کے خلاف سازش میں اسے مدد ملے۔

1349 - اُسِّسَ۔ اُسّ اور اَسَاسٌ بنیاد کو کہتے ہیں جس پر عمارت بنائی جائے اور جہاں سے کسی چیز کی ابتدا ہو اسے بھی کہتے ہیں۔ اور انسان کا اُسّ اس کا قلب ہے۔ (ل) تقویٰ پر بنیاد ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے بنانے میں تقویٰ مدنظر تھا۔

**اس مسجد سے مراد مسجد قبا ہے۔** گو بعض روایات میں مسجد نبوی کا ذکر بھی ہے مگر قول اول کو ترجیح ہے اور یہ جو فرمایا کہ اس میں لوگ ہیں جو پاک ہونا چاہتے ہیں تو مراد **ظاہری طہارت** نہیں گو چند روایات اس کی تائید میں ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف نے اس تطہیر کا ذکر پہلی شرارتوں کے مقابل پر کیا ہے۔ ظاہری طور پر پاکیزہ کپڑوں سے تو مسجد ضرار میں بھی جاسکتے تھے۔ مراد قلوب کی پاکیزگی ہے یعنی ہر قسم کی شرارت سے پاک ہونا۔ جیسے تقویٰ پر بنیاد رکھنے سے مراد یہ نہیں کہ تقویٰ کوئی جسمانی شے تھی جس پر بنیاد رکھی گئی۔

اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور رضا پر رکھی اچھا ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھوکھلے گرتے ہوئے کنارے پر رکھی سو وہ اس کو جہنم کی آگ میں لے گرا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (1350)

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع 13 11 2

ان کی عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں کی بے چینی کا موجب رہے گی، یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (1351)

---

1350 - بُنْيَان۔ بَنٰی سے جس کے معنی ہیں عمارت بنائی اور بُنْيَانٌ دیوار کو بھی کہتے ہیں ﴿كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ [الصف: 4:61] ''گویا کہ وہ مضبوط دیوار ہیں۔'' اور ہر چیز کو جو بنائی جائے۔ چنانچہ دوسری جگہ آیا ہے ﴿فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ﴾ [النحل: 26:16] ''سو اللہ نے ان کی عمارت کو بنیادوں سے گرایا۔'' جہاں مراد ان کی تدابیر کی عمارت ہے۔ چنانچہ بناء کا لفظ جسم انسانی پر بھی بولا گیا ہے [مَنْ هَدَمَ بِنَاءُ رَبِّهٖ] اور بِنْيَةٌ فطرت کو کہا گیا ہے۔ (ل)

شَفَا۔ شَفَا کنوئیں وغیرہ کے کنارے کو کہتے ہیں اور ہلاکت سے قرب میں مثال کے طور پر بولا جاتا ہے جیسے یہاں اور شِفاء بیماری سے بھی ہوتی ہے جو گویا سلامتی کے کنارہ کو پالینا ہے۔ (غ)

جُرُفٍ۔ جَرَفٌ کسی چیز کا بہت سا یا سارے کا سارا لے لینا ہے اور جرف وادی اور نہر کی جانب کا پچھلا حصہ ہے جسے سیل بہالے جاتا ہے اور اس کا اوپر کا حصہ آگے بڑھا ہوا رہ جاتا ہے پھر جب وہ اوپر کا حصہ پھٹ جائے تو اسے هَارَ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں جو طاعون جارو ف کا ذکر ہے اسی مادہ سے ہے۔ (ل)

هَارٍ۔ اِنْهَارٌ، [هَارَ الْبِنَاءُ] دیوار گر گئی۔ اِنْهَارٌ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو بلند جگہ سے نیچے گر جائے۔

یہاں مراد سچ مچ عمارتوں کا بنانا نہیں بلکہ مومن اور منافق کی حالت کو تشبیہ دی ہے۔ ایمان کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور نفاق کی بنیاد نہایت کمزور ہے۔

1351 - رِيْبَةً۔ رِيْبَ سے اسم ہے اور ﴿بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ کی تفسیر میں [تَدُلُّ عَلٰى دَغْلٍ وَّ قِلَّةِ يَقِيْنٍ] یعنی یہ کھوٹ اور قلت یقین پر دلالت کرتا ہے۔ (غ)

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۟ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۱

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں (اس کے) بدلہ میں کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، سو مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔ یہ وعدہ اس کے ذمے سچا ہے، توریت اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو کون پورا کرنے والا ہے۔ سو اپنے سودے پر جو تم نے اس سے کیا ہے خوش ہو جاؤ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ (1352)

---

﴿تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ﴾ قَطَعَ کے معنی ہیں کسی چیز کا علیحدہ کر دینا جسم سے ہو یا معناً جیسے ﴿وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ [البقرة: 27:2] ''اور اسے کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ ملایا جائے۔'' اور **دلوں کے کٹنے سے مراد** یہ ہے کہ مر جائیں یا یہ کہ ایسی توبہ کریں جس سے ان کے دل ندامت کے مارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ (غ)

یہاں خود ان کی اس عمارت کو رِيْبَةٌ کہا ہے یعنی شک اور قلق اور اضطراب جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مراد ان کا دین ہے۔

1352 - **مسلمانوں کا عہد:** جب منافقوں کا ذکر ہو چکا تو اب بتایا کہ وہ لوگ جو فی الواقع مومن ہیں ان کا کیا طریق ہے۔ جان اور مال دو ہی چیزیں انسان کو بہت پیاری ہیں۔ سو سب سے پہلے یہ فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں اور اس کا معاوضہ جنت قبول کر چکے ہیں۔ گویا اللہ پر ایمان کی حقیقت بتائی کہ انسان اپنی محبوب ترین چیزوں کو اپنا نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا مال سمجھے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کے ساتھ عہد ہے جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے جنت کے مستحق ہوں گے۔ اور وعدۂ جنت میں اس دنیا کی کامیابی کا وعدہ بھی شامل ہے۔ جیسا کہ متعدد مقامات سے ظاہر ہے۔ لیکن اگر مسلمان اپنے عہد پر قائم نہ رہیں تو معاوضہ کے بھی وہ مستحق نہ ہوں گے۔ پس ہر ایک شخص کو جو مسلم کہلاتا ہے یا ایمان کا دعویٰ کرتا ہے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال دونوں بیچ چکا ہے اور ان پر اس کا کوئی حق نہیں اور اب وہ بطور ایک امین کے ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کو لگائے۔

### صحابہؓ نے اس عہد کو کس طرح پورا کیا:

اس وعدہ کے بعد ان کے کاموں کا ذکر کیا اور چونکہ پچھلے رکوعوں میں منافقوں کی سب سے بڑی علامت یہ بتائی کہ وہ لڑائی کے

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ
السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ
الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے،
خدا کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ
کرنے والے، بھلائی کا حکم دینے والے اور برائی سے
روکنے والے اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے

---

لیے نہیں نکلتے اس لیے مقابلہ کے طور پر یہاں مومنوں کے جنگ کرنے کا ذکر کیا۔ منافق نماز میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے دیتے تھے اور احکام ظاہری نکاح وغیرہ کے معاملات میں بھی شریعت قرآنی پر عمل کر لیتے تھے مگر جنگوں کے پیش آنے پر ان میں اور مومنوں میں مابہ الامتیاز یہ ہو گیا کہ وہ جنگوں میں نہ نکلتے تھے۔ اس لیے یہاں مومنوں کے ساتھ وعدہ کا ذکر کر کے عمل کے رنگ میں اس چیز کو پیش کیا جو منافقوں اور مومنوں میں مابہ الامتیاز تھا۔ یعنی جنگ کرنا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ظاہر ہے کہ جان اور مال کو دینے کا پورا امتحان جنگ میں ہی ہوتا ہے۔ اس لیے وعدہ کے ذکر کے ساتھ اس چیز کا ذکر کیا جو ایفائے وعدہ کے لیے ایک محک کے طور پر کام دے سکتی تھی۔ لیکن يُقَاتِلُوْنَ سے یہ مراد لینا کہ خواہ مخواہ لوگوں کو مارتے پھرتے ہیں پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ جنگ کی ضرورت جو پیش آئی وہ خود کھول کر قرآن شریف بیان فرما چکا ہے ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ [البقرة: 190:2] ''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔'' انہی جنگوں میں نہ شامل ہونے پر منافقوں کو الزام دیا اور انہی میں شمولیت اختیار کرنے کو مومن کے وعدہ کا ایفا قرار دیا۔

تیسری بات جو یہاں بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ یہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ کا مومنوں کے ساتھ ہے یہ توریت اور انجیل اور قرآن سب میں پایا جاتا ہے۔ گویا **سب انبیاء یہی وعدہ لیتے تھے**۔ ظاہر ہے کہ جس وعدہ کا اوپر ذکر ہے وہ یہی ہے کہ جنت کے عوض اپنی جانوں اور مال کو بیچ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر وعدہ یہ ہے کہ مومن جان اور مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے گا اور اللہ تعالیٰ اسے جنت دے گا۔ عیسائی جو قرآن کریم کے بیانات کو توڑ مروڑ کر محل اعتراض بنانے کے عادی ہیں کہتے ہیں یہ قرآن کریم نے جھوٹ کہا ہے ایسا کوئی وعدہ توریت اور انجیل میں نہیں۔ غالباً یہ لفظ قلم سے نکالتے وقت پادری صاحبان کا خیال يُقَاتِلُوْنَ کی طرف تھا کیونکہ اسلام میں قتال کی اجازت انہیں سب سے بڑا عیب نظر آتا ہے۔ حالانکہ جس مصیبت کی حالت میں پہنچ کر مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی کوئی عقلمند ایک لمحہ کے لیے بھی ان حالات میں جنگ کرنے پر اعتراض نہیں کر سکتا اور موسوی شریعت میں تو ایسی کوئی شرائط جنگ کے لیے قطعاً نہیں اور خود عیسائی قومیں جب اپنے آپ کو طاقتور پاتی ہیں تو ادنیٰ ادنیٰ بہانوں پر جنگ کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ مگر بہر حال يُقَاتِلُوْنَ میں کسی وعدہ کا ذکر نہیں۔ ایفائے عہد کا ذکر ہے اور وعدہ کا ﴿اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ میں ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ **یہی وعدہ توریت اور انجیل میں موجود ہے**۔ جب ایک دولت مند **حضرت مسیح** کے پاس آیا اور پوچھا کہ اے نیک استاد میں کون سا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ اور مومنوں کو خوش خبری دے۔ (1353)

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا نبی کے لیے شایاں نہیں اور (نہ) ان کے لیے جو ایمان لائے کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش مانگیں، گو وہ

---

''اگر تو کامل ہوا چاہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آ کے میرے پیچھے ہو لے۔'' [متی 21:19]

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی یہی تعلیم تھی:

''تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ۔''

جنت یا آسمان کی بادشاہت دنیا پر لات مارنے کے بغیر نہیں ملتی۔

1353 - السَّآئِحُوْنَ۔ سَاحَةٌ فراخ مکان کو کہتے ہیں اور [سَاحَةَ الدَّارِ] گھر کے صحن کو کہتے ہیں ﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ﴾ [الصافات: 177:37] ''سو جب وہ ان کی انگنائی میں آ اُترے گا۔'' اور [سَاحَ فِي الْاَرْضِ] کے معنی ہیں زمین میں گزرا یا سیاحت کی ﴿فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ [التوبة: 2:9] ''پس چار مہینے ملک میں چلو پھرو۔'' اور سائح اس پانی کو کہتے ہیں جو دائم طور پر جاری ہو اور سیاح اور سَائِحٌ سیاحت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (غ) اور سَآئِحُوْنَ جو یہاں آیا ہے اور ﴿سٰٓئِحٰتٍ﴾ [التحریم: 5:66] کے معنی روزہ رکھنے والے صحابہ اور تابعین سے مروی ہیں۔ بلکہ ایک حدیث میں یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سَآئِحُوْنَ کے معنی صَائِمُوْنَ ہیں اور ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے سیاحت کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا کہ میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ (ث) مگر عموماً روزہ رکھنے والے معنی ہی قبول کیے گئے ہیں اور مفردات میں بھی ہے [اَلسَّائِحُوْنَ اَیْ اَلصَّائِمُوْنَ] اور [اَلسَّائِحَاتِ اَیْ اَلصَّائِمَاتِ] پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو طرح پر ہے۔ ایک حقیقی یعنی کھانے پینے کا ترک کرنا اور دوسرا حکمی یعنی جوارح کا معاصی سے محفوظ رکھنا۔ اور سَائِحٌ اسی روزہ کا رکھنے والا ہے۔

پہلی آیت میں مومنوں کے عہد کا ذکر کیا اور اس میں ان کی صفات بیان کیں۔ سب سے پہلے تائب یعنی سب قسم کے گناہوں سے توبہ کرنے والے پھر عابد یعنی قویٰ کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگانے والے۔ پھر حامد یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے اور جس کی حمد کی جائے اس کی صفات کو انسان اپنے اندر لیتا ہے۔ پس حَامِدُوْنَ اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگین ہونے والے ہیں۔ پھر سَآئِحُوْنَ یعنی روزہ رکھنے والے یا اپنے جوارح کی پوری حفاظت کرنے والے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کی حالت اختیار کرنے والے۔ پھر دوسروں کو نیکی کی راہ پر ڈالنے والے اور برائی سے روکنے والے اور سب سے آخر حدود اللہ کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جانے والے۔ یہ وہ مومن ہیں جن کے لیے خوش خبری ہے۔

اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۳﴾

قریبی ہوں۔اس کے بعد کہ ان پر کھل گیا کہ وہ دوزخ والے ہیں۔(1354)

---

1354 - اس آیت کی رو سے **ان مشرکوں کے لیے استغفار منع کیا گیا ہے** جن کے متعلق یہ کھلے طور پر معلوم ہوجائے کہ وہ اصحاب جحیم ہیں۔صحیح بخاری اور دیگر صحاح میں اس کا شان نزول **ابوطالب کی وفات** کو بیان کیا گیا ہے جو ہجرت سے پیشتر کا واقعہ ہے اور اس سورت کا نزول 9 ہجری کا ہے۔اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ برابر اس کے لیے استغفار کرتے رہے جب تک کہ کفار سے قطع تعلق کی وجہ سے اس سورت کے نزول کے وقت آپ کو روکا نہیں گیا اور **بعض احادیث میں اس کا شان نزول آپ کا اپنی والدہ کے لیے استغفار کرنا بتایا گیا ہے**۔ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا مگر آپ کی والدہ جو آپ کی بعثت سے چونتیس سال پیشتر وفات پا چکی تھیں ان کے متعلق ایسا خیال جائے تعجب ہے۔فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا ﴿فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی﴾ [طٰہٰ: 51:20] تمہارے آنے سے پیشتر جو نسلیں گزر چکیں ان کا کیا حال ہے۔تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا ﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ﴾ [طٰہٰ: 52:20] ''ان کا علم میرے رب کے پاس ہے۔'' بعثت نبی سے پیشتر جو لوگ ہوتے ہیں یا جن کو تبلیغ نہیں پہنچی ان پر مواخذہ بھی صرف اس روشنی کے مطابق ہوتا ہے جو عقل اور فطرت کے ذریعہ سے ان کو دی گئی ہے۔نبی کے انکار کا لفظ ان پر نہیں آتا اور آنحضرت ﷺ کی والدہ کا صحیح فطری مذہب پر قائم ہونا خود ﴿وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۝﴾ [الشعرآء: 219:26] ''اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے پھرتے رہنے کو (دیکھتا ہے)۔'' کی اس تفسیر سے ظاہر ہے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مراد اس سے آپ کا انتقال ایسے آباء اور امہات میں ہوتے رہنا ہے جو ساجدین میں داخل تھے۔

**استغفار کی ممانعت کو اس بات کے ساتھ مشروط کیا** ہے کہ ان کا دوزخی ہونا صراحت سے معلوم ہوجائے۔مفسرین نے صرف دو ہی صورتیں ایسی تبین کی ٹھہرائی ہیں ایک یہ کہ ایک شخص حالت کفر پر مرجائے، دوسرا یہ کہ وحی سے معلوم ہوجائے کہ ایک شخص نا قابل اصلاح ہے اور قرآن کریم نے خود جو تصریح فرمائی ہے وہ اگلی آیت میں مذکور ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا استغفار ہے اس وقت رکنا بیان کیا گیا ہے جب یہ واضح ہوگیا کہ وہ شخص خدا کا دشمن تھا۔پس اصل بات تو یہی ہے کہ استغفار سے روکنے کی غرض صرف یہی ہے کہ جو شخص کھلے طور پر حق اور صداقت کا جو اللہ تعالیٰ نے بھیجی ہے دشمن ہو اس کے لیے طلب حفاظت الٰہی یا طلب معافی بے معنی ہے۔خدا کے دشمنوں سے ایسا تعلق مومن کو شایاں نہیں اور کسی شخص کی ایسی دشمنی پر قطعی یقین تو وحی الٰہی سے ہی پیدا ہوتا ہے گو بعض وقت واقعات بھی بتا دیتے ہیں۔مگر اس نہی میں عام مشرک یا کافر شامل نہیں۔**ہاں جو لوگ حالت شرک یا کفر پر مرجائیں ان کی نماز جنازہ کے نہ پڑھنے کا استدلال بھی اس سے کیا جاسکتا ہے**۔اور اصل تو یہ ہے کہ نماز جنازہ صرف مسلمان کا حق مسلمان پر ہے۔انسانی ہمدردی کا حق اور ہے اور اسلامی ہمدردی عامہ انسانی ہمدردی کے حق کے علاوہ ہے۔نماز جنازہ بغیر تعلق اخوت اسلامی جائز نہیں۔ہاں اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت سے جس طرح چاہے ان سے معاملہ کرے۔

وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور ابراہیم کا اپنے بزرگ کے لیے بخشش مانگنا صرف ایک وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا۔ پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے الگ ہوگیا۔ یقیناً ابراہیم بہت نرم دل اور بردبار تھا۔(1355)

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ

اور اللہ (کی شان) نہیں کہ ایک قوم کو گمراہ قرار دے جب انہیں ہدایت دے چکا جب تک کہ ان کے لیے بیان نہ کردے جس سے انہیں بچنا چاہیے۔

---

مگر نماز جنازہ انہی لوگوں کی ہوسکتی ہے جو ظاہر طور پر اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

1355 - اَوَّاہٌ وہ جو کثرت سے تَاَوَّہْ کرے یا اَوَّہْ کہے اور تَاَوُّہْ ہر وہ کلام ہے جو حزن پر دلالت کرے اور مراد اس سے ایسا شخص لیا جاتا ہے جو بہت خشیۃ اللہ کو ظاہر کرے۔ (غ) نرم دل اس لیے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ کثرت خشیۃ اللہ سے نرم دلی پیدا ہوتی ہے۔ ابن جریر میں جو اقوال اس کے معنی میں نقل کیے گئے ہیں ان میں الرحیم کو ترجیح ہے یعنی اس سے مراد رحم کرنے والا ہے۔

## ابراہیمؑ اور آزر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے اَبّ یا بزرگ کے لیے استغفار سے روکا جانا یہاں سے صراحت سے ثابت ہے حالانکہ والدین کے لیے استغفار آخر عمر تک کرتے رہے ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ ﴾ [ابراھیم: 14:41] ''ہمارے رب! میری حفاظت فرما اور میرے باپ کی۔''

اَبّ کے لیے [دیکھو نمبر: 967]۔ باوجود اس کے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام۔۔۔ کا بزرگ تھا۔ جب اس کی حالت معمولی کفر کی حالت سے نکل کر یہاں تک پہنچ گئی کہ کھلے طور پر اللہ تعالیٰ کا دشمن ہوگیا تو پھر اس کی بخشش کی دعا کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس ناحق اور باطل کو جو حق اور صداقت کو کچلنا چاہتا ہے دنیا میں سرسبز کرے ہاں جب تک ایسا نہ ہو اس وقت تک غیروں کے لیے بھلائی مانگنا بھی مقام مدح پر ہے۔ وعدہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اس کی تصریح دوسری جگہ ہے [دیکھو مریم: 47:19]، جہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود آزر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سنگسار کرنے کی دھمکی دینے اور ان سے علیحدگی اختیار کر لینے کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے استغفار کا وعدہ کیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک استغفار کو نہیں چھوڑا جب تک کہ آزر کی دشمنی اور استیصال حق کی کوشش انتہا کو نہیں پہنچ گئی۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اللہ سب باتوں کا جاننے والا ہے۔ (1356)

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۱۶﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ کے سوائے تمہارا کوئی حمایتی نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾

اللہ نبی پر اور ان مہاجرین اور انصار پر مہربان ہوا جنہوں نے تنگی کی گھڑی میں اس کا ساتھ دیا، اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل پھر جاتے، پھر ان پر مہربان ہوا وہ ان پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔ (1357)

---

1356 - ان الفاظ سے یہ مراد لی گئی ہے کہ مسلمانوں کے مشرکوں کے لیے استغفار کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ضلالت قرار نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اس حکم کو کھول کر قرآن کریم میں بیان کر دیا۔ ہاں حکم کے آ جانے کے بعد جو شخص ایسا کرے وہ ضلالت میں ہوگا اور یُضِلَّ کے معنی گمراہ قرار دینا ہی لیے گئے ہیں۔

1357 - تَّابَ لفظ تَابَ کے معنی پر یہ آیت کھلی شہادت ہے کہ اس سے مراد صرف گناہ پر رجوع ہی نہیں بندہ کی طرف سے ہو یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ بلکہ جیسا کہ [نمبر: 57] میں بیان کیا گیا ہے ایک اچھی حالت سے اس سے زیادہ اچھی حالت کی طرف رجوع کرنا بھی تَابَ میں داخل ہے۔ یہاں نبی اور مومنین کا قطعاً کوئی گناہ نہیں بلکہ ﴿الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ میں ان کی تعریف ہی کی گئی ہے۔ تاہم فرمایا ﴿تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ﴾ اور مراد صرف اس قدر ہے کہ بڑے بڑے فضل کیے اور یہ اس کے مطابق ہے جو لغت میں تَابَ کے معنی دیئے ہیں کہ اصل معنی [عَادَ اِلَى اللّٰهِ وَ رَجَعَ وَ اَنَابَ] ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف عود کیا اور لوٹ آیا اور جھک گیا۔ (ل)

﴿سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ عُسْرٌ۔ یُسْرٌ کی ضد ہے اور یہاں ﴿سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ سے مراد غزوہ تبوک لیا گیا ہے۔ جس میں صحابہ کو تکلیف شاقہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ بعض وقت ایک کھجور کو دو آدمیوں نے بانٹ کر اس پر پانی پی کر گزارہ کیا۔ اور دو دو تین تین آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوتے۔ یہ ان کے کمال صداقت اور اخلاص کا ثبوت تھا اس لیے خصوصیت سے اس کا ذکر کیا۔

وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ع 14 8 3

اور ان تین پر جو پیچھے رکھے گئے تھے یہاں تک کہ زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور وہ اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور یقین کرلیا کہ اللہ (کی سزا) سے سوائے اس کے کوئی پناہ نہیں، تب وہ ان پر مہربان ہوا تاکہ وہ پھر آئیں اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1358)

---

مسلمانوں کی جانثاری کا کمال:

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس سخت مصیبت اور مقابلہ کے وقت مسلمانوں نے خوش دلی سے آنحضرت ﷺ کی آواز پر لبیک کہا۔ صرف ایک گروہ کے متعلق ذکر کیا کہ ان کے دلوں میں کچھ کمزوری کا خیال آیا تھا مگر اس پر بھی كَادَ کا لفظ بول کر بتا دیا کہ فی الواقع کوئی زیغ ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ آنحضرت ﷺ کی قوت قدسی کا اثر تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس مقام اتباع تک پہنچایا کہ وہ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگین تھے۔

1358 - خُلِّفُوْا۔ خَلَّفْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اسے اپنے پیچھے چھوڑا مگر مُخَلَّفُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پیچھے رہ گئے اور یہی مراد خُلِّفُوْا سے ہوسکتی ہے یعنی جو پیچھے رہ گئے۔ مگر عموماً مراد اس سے لی گئی ہے کہ ان کا حکم پیچھے رکھا گیا یعنی وہ جن کے متعلق فرمایا تھا ﴿اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ﴾ [106] ''اور کچھ اور اللہ کے حکم کے لیے پیچھے رکھے گئے ہیں۔'' خود کعب نے جو ان میں سے ایک تھے یہی معنی خُلِّفُوْا کے لیے ہیں۔

ضَاقَتْ۔ ضِيْقَ وسعت کی ضد ہے اور اس کا استعمال فقر اور بخل اور غم وغیرہ پر ہوتا ہے ﴿وَ ضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ﴾ [هود: 12:11] ''اور تیرا سینہ اس پر تنگ ہوگا۔'' ﴿يَضِيْقُ صَدْرِيْ﴾ [الشعرآء: 13:26] ''اور میرا سینہ رکتا ہے۔'' ﴿وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ﴾ [النحل: 127:16] ''اور اس کی وجہ سے تنگ نہ ہو جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔'' میں اور یہاں مراد حزن ہے۔ (غ)

رَحُبَتْ۔ رُحْبٌ مکان کی وسعت کو کہتے ہیں اور اس کا استعمال ضیق کی طرح بطور استعارہ بھی ہوجاتا ہے جیسے یہاں اور اسی سے مَرْحَبًا ہے۔ (غ)

**یہ تین شخص جن کا یہاں خصوصیت سے علیحدہ ذکر کیا گیا ہے کعب بن مالک، مرارۃ بن الربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم تھے۔** ان کا ذکر صحیح احادیث میں ہے اور ایک طویل حدیث میں خود کعب نے یہ ذکر کیا ہے۔ غزوہ تبوک میں تیاری کو ایک سے دوسرے دن پر ملتوی کرتے کرتے یہ لوگ پیچھے رہ گئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ بہت دور نکل گئے۔ تب انہوں نے ارادہ ترک کر دیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ (1359)

---

واپسی پر جب بہت سے منافقین نے جھوٹے عذر پیش کیے تو کعب اور ان کے دونوں ساتھیوں نے رسول اللہ ﷺ سے سچ سچ کہہ دیا کہ ہمارا عذر کوئی نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ان کے بارہ میں نازل نہ ہو مسلمان ان سے قطع تعلق کر لیں۔ پچاس دن تک ان تینوں کی یہ حالت رہی کہ کوئی شخص ان سے کلام تک نہ کرتا تھا۔ کعب کہتے ہیں کہ میں مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز بھی پڑھنے آتا مگر کوئی شخص مجھ سے کلام نہ کرتا۔ انہی ایام میں جب ایک دن میں بازار میں پریشان پھر رہا تھا **ملک غسان** کے ایک قاصد نے میرا پتہ دریافت کیا اور مجھے بادشاہ کا ایک رقعہ دیا جس میں لکھا تھا کہ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے ساتھ سختی ہوئی ہے اور ذلت کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ تم ہمارے پاس چلے آؤ ہم تم سے ہمدردی کریں گے۔ کعب کہتے ہیں میں نے سمجھا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے اور اس رقعہ کو لے کر تنور کا رخ کیا اور اسے جلا دیا۔ پچاس دن کے بعد اس آیت کے نزول پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو یاد فرمایا اور بشارت دی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ **آنحضرت ﷺ کے صحابہ کو سچائی سے کس قدر محبت تھی** کہ اس کی خاطر خود رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں کی۔ ایک طرف اگر یہ صحابہ کا گروہ جان نثاری میں اور مال و جان کے قربان کرنے میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا تو دوسری طرف اخلاق فاضلہ میں بھی تاریخ عالم دوسرا کوئی ایسا گروہ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تینوں میں سے کعب علاوہ تبوک کے صرف بدر میں غیر حاضر تھے اور دوسرے دونوں اصحاب بدر میں بھی شامل تھے۔ بایں غزوہ تبوک میں نہ جانے کی وجہ سے ان پر ایسی سختی ہوئی۔ وہ مسلمان غور کریں جو آج خدمت اسلام کو ایک بے معنی چیز ٹھہرا کر صرف اپنے نفسوں کے فکر کو کافی سمجھے ہوئے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ کسی نے نماز پڑھ لی اور سمجھ لیا کہ ہم جنت کے وارث ہو گئے۔

منجملہ اور امور کے جو ان تینوں شخصوں کے ذکر میں مقصود ہیں ایک یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جان نثاری اور اطاعت کس حد تک پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام بلند عطا فرمایا جو کسی قوم کی قوم کو دنیا میں نہیں ملا ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ ایک طرف اس جنگ کی مشکلات کو رکھو۔ خطرناک گرمی، عرب کا ملک، فصلیں پکی ہوئی، لمبا سفر۔ سواریوں کا پورا انتظام نہیں، نہ سامان رسد کا، عظیم الشان شہنشاہ کی فوج سے مقابلہ ہے۔ سب لوگ اپنی تجارتیں کر کے اور کاروبار کر کے معاش پیدا کرنے والے ہیں، کوئی فوج نہیں مگر تیس ہزار تو ساتھ ہوتے ہیں اور صرف تین پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کیا ایسی اطاعت اور ایسی جاں نثاری کی کوئی مثال دنیا میں مل سکتی ہے (منافقوں کو الگ رکھو کیونکہ وہ دل سے ہی اسلام کے دشمن تھے) گویا دس ہزار میں سے صرف ایک کمزوری دکھاتا ہے اور وہ کمزوری بھی خود عظیم الشان مدح کا پہلو ساتھ لیے ہوئے ہے کہ اس میں ان کی صداقت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

1359 - **معیت صادقین کا حکم:** یہ آیت قرآن کریم کی ترتیب ابلغ اور محکم پر گواہ ہے۔ پچھلی آیت میں ان تین شخصوں کا ذکر تھا جو

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ

مدینہ کے رہنے والوں اور ان کے ارد گرد کے دیہاتیوں کو نہ چاہیے کہ اللہ کے رسول کے پیچھے رہ جائیں اور نہ (یہ کہ) اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ چاہیں۔ یہ اس لیے کہ انہیں اللہ کی راہ میں نہ پیاس پہنچتی ہے اور نہ تکان اور نہ بھوک اور نہ وہ کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جس سے کافروں کو غصہ آتا ہے اور نہ دشمن سے کچھ چیز حاصل کرتے ہیں مگر اس کے لیے ان کا نیک عمل لکھا جاتا ہے۔

---

ہمیشہ غزوات میں شامل ہوتے ہوتے غزوہ تبوک سے رہ گئے تو ان پر اس قدر عتاب اللہ تعالیٰ کا ہوا کہ پچاس دن تک کسی مسلمان کو ان سے بولنے کی اجازت نہ تھی۔ حالانکہ وہ نمازیں پڑھتے اور سب مسلمانوں والے کام کرتے اور مسلمانوں کی جماعت میں سے تھے۔ تو سمجھایا کہ ضروریات دینی میں جو مسلمان ان ضروریات کو محسوس کر کے ان کے پورا کرنے کا تہیہ نہ کریں وہ اس بات کے اہل نہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوں۔

**صادقین سے مراد راستباز خادمان دین ہیں جیسے مجدد:**

اب نبوت کا سلسلہ تو منقطع ہونا تھا مگر ضرورت دینی ختم ہونے والی نہ تھیں۔ اس لیے اس کے فوراً بعد مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ جو صادق راستباز تمہارے اندر پیدا ہوں اور ضروریات دینی کی طرف قوم کی رہنمائی کریں تو قوم کا ان کے ساتھ ہو جانا اس وقت کا سب سے اہم فرض ہوتا ہے اور صادقین سے مراد یہاں ایسے لوگ ہیں جو خدمت دین میں صدق دکھاتے ہیں۔ نہ صرف سچ بولنے والے صادق کے اس معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 388]۔ اور قرآن شریف نے خود فرمایا ہے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾ [الحجرات: 15:49] ''مومن صرف وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، پھر کچھ شک نہیں کرتے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ یہی سچے ہیں۔'' اور یہاں بھی اگلی آیت میں مصائب اٹھانے کے ذکر میں یہی اشارہ ہے کہ صادق کہلانے کا وہی مستحق ہے جو خدا کی راہ میں دکھ اٹھاتا اور کام کرتا ہے۔ آج مسلمان قرآن شریف سے اس قدر دور پڑے ہوئے ہیں کہ کثرت سے یہی کہتے اور جواب دیتے ہیں کہ فلاں شخص مجدد زمانہ ہے تو ہو ہم نمازیں پڑھتے ہیں۔ کاش کبھی قرآن پر تھوڑا سا بھی غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ صادقوں کے ساتھ ہونے کے حکم کو یہاں لا کر قرآن شریف نے اسے کس قدر اہمیت دی ہے۔

صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔(1360)

---

1360- يَرْغَبُوْا۔ رَغَبٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 165]۔ کسی چیز کے ساتھ رغبت ہونا اس کے لیے حرص اور اس میں طمع ہے۔ حدیث میں ہے کہ [كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا مَرِجَ الدِّينُ وَظَهَرَتْ إِمَارَةُ الرَّغْبَةِ] (مسند احمد، جلد58، صفحہ206، حدیث:27586) تمہاری کیا حالت ہوگی جب دین ابتری کی حالت میں ہوگا اور رغبت ظاہر ہوگی۔ جس سے مراد مال کے جمع کرنے کی حرص ہے۔ (ل) یہاں بھی اپنی زندگی پر حرص مراد ہے۔

﴿ظَمَأٌ﴾۔ ظَمْءٌ وہ وقفہ ہے جو دو دفعہ پانی پینے کے درمیان ہو۔ اس لیے ظَمَا پیاس ہے اور ظَمْاٰنَ پیاسا۔ ﴿لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا﴾ [طٰہٰ: 119:20] ''تو اس میں نہ پیاسا رہے۔'' ﴿يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾[النور: 39:24] ''جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔''

نَصَبٌ۔ نَصْبٌ کے اصل معنی گاڑ دینا ہیں اور نُصُبٍ ۔۔۔ اور نَصَبٌ تکان کو کہتے ہیں ﴿مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ؕ﴾ [صٓ: 41:38] ''شیطان نے تکان اور تکلیف پہنچائی ہے۔'' ﴿لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ﴾[الحجر: 48:15] ''انہیں ان میں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔''

مَخْمَصَةٌ۔ [خَمْصَ الْبَطْنَ] پیٹ کی لاغری کو کہتے ہیں۔ اس لیے مَخْمَصَةٌ بھوک ہے جس سے پیٹ کی لاغری پیدا ہوتی ہے۔ (غ)

يَطَئُوْنَ۔ مَوْطِئًا۔ وَطِئَ کے معنی پامال کیا اس لیے زمین کو پامال کرنا یا زمین پر چلنا۔ جیسے یہاں اور مَوطِئِی کے معنی موضع یعنی جگہ۔ (ل) اور [اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرَ] (صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب يَهْوِي بِالتَّكْبِيرِ حِينَ يَسْجُدُ، : 804) میں مراد ہے اس کو ذلیل کر دے یا فرمانبردار کر دے اور مُوَاطَاةٌ کے معنی مطابقت ہیں۔ گویا جہاں ایک پاؤں رکھتا ہے وہیں دوسرا رکھتا ہے اس معنی میں ہے ﴿لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ﴾[التوبة: 37:9] ایسی جگہ چلتے ہیں جس سے کافروں کو غضب آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دشمن اس سے مرعوب ہوتا ہے۔

يَنَالُوْنَ۔ نَيْلًا۔ نَيْلٌ وہ ہے جسے انسان اپنے ہاتھ سے لیتا ہے اور [نَوْلَ (نَالَ يَنَالُ)] اور تَنَاوُلٌ کے معنی لینا یا حاصل کرنا ہیں۔ (غ) دشمن سے کچھ لیتے ہیں یعنی فتح یا کوئی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ دشمنان دین کے مقابلہ پر جو کام کیے جائیں وہ سب عبادت میں داخل ہیں اور انسان کے اعمال صالحہ کا کام دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں اس سے بڑھ کر کون سا کام ہوسکتا ہے جس سے دین اسلام کو زندگی ملے۔ عمل صالح درحقیقت وہی عمل ہے جو انسان کے لیے موجب بقا ہے۔ مگر انسان کی زندگی سے بڑھ کر حق اور صداقت کا زندہ رہنا۔ اس لیے حق اور صداقت کو زندہ رکھنے کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں وہ انسان کے بہترین اعمال صالحہ میں ہیں۔ کیونکہ ان سے انسان کا اپنا بھی بقا ہے۔ کس قدر لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ صرف اندر بیٹھ کر خدا کا نام لینے کو عمل صالح سمجھتے ہیں اور طرح طرح کے مجاہدات اختیار کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ **دشمنان دین کا مقابلہ** کرنا وہ مجاہدہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم

وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّ لَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور نہ وہ کچھ خرچ کرتے ہیں تھوڑا یا بہت اور نہ کسی میدان سے گزرتے ہیں مگر وہ ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ انہیں اس کا بہترین بدلہ دے جو وہ کرتے تھے۔ (1361)

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع 15 4 4

اور مومنوں کو یہ بھی مناسب نہیں کہ سب کے سب نکل پڑیں تو کیوں نہ ان کی ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف واپس جائیں تاکہ وہ بھی بچیں۔ (1362)

---

کو چلایا اور یوں بتادیا کہ یہ **بہترین مجاہدہ** ہے۔ ہاں دشمنان دین کا مقابلہ جب وہ تلوار اٹھائیں تو تلوار سے ہے۔ لیکن آج سب سے بڑا مقابلہ علم اور دلائل کے رنگ میں ہے اور جس طرح پر ایک مجاہد بالسیف کا بھوک پیاس کو برداشت کرنا، دکھ اٹھانا، دشمن کو زک دینا، رستے طے کرنا عمل صالح ہے اسی طرح ایک مجاہد بالقلم یا باللسان کا انہی باتوں کو برداشت کرنا یا ان کو کر دکھانا عمل صالح ہے۔ جس سے نہ صرف انسان کو خود قلب کی صفائی میسر آتی ہے بلکہ وہ حق اور صداقت کے بقا میں بھی معاون ہوتا ہے اور یوں تمام مجاہدات سے افضل یہ مجاہدہ ہے۔ یہاں لفظ ایسے اختیار کیے ہیں جن میں مجاہدات سیف اور مجاہدات علمی دونوں آجاتے ہیں۔ بلکہ یہاں اصل مقصود **علمی مجاہدات** کا ذکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ جیسے رکوع کی آخری آیت میں صاف بتادیا ہے جہاں جہاد بالسیف کے لیے نکلنے کا ذکر حذف کر کے جہاد علمی کے لیے نکلنے کا ذکر کیا ہے۔

1361 - ﴿يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا﴾ قطع کسی چیز کا الگ کر دینا ہے اور [**قَطَعَ الطَّرِيْقُ**] سے مراد سیر یعنی چلنا بھی ہوتا ہے۔ جیسے یہاں قطع وادی کے معنی وادی میں سے گزرنا ہیں اور رستے چلنے والوں سے مال چھیننا بھی مراد ہوتا ہے جیسے ﴿وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ﴾ [العنکبوت: 29:29] ''اور راہ مارتے ہو۔'' (غ)

پچھلی آیت میں خود تکلیف، بھوک، پیاس وغیرہ کے اٹھانے یا دشمن پر کسی قسم کا غلبہ حاصل کرنے کا ذکر تھا اس میں بتایا کہ خواہ کوئی ایسی تکلیف نہ پہنچے اور خواہ اس سے کوئی غلبہ حاصل نہ ہو **محض خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور خدا کی راہ میں نکلنا بجائے خود ہی ایک عمل صالح ہے۔**

1362 - يَتَفَقَّهُوْا - فقہ علم شاہد سے علم غائب کی طرف پہنچنا ہے۔ علم عام ہے اور یہ خاص ہے ﴿لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ [النسآء:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تم میں شدت پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ (1363)

---

78:4] ''بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔'' اور احکام شریعت کے علم پر بالخصوص بولا جاتا ہے اور تَفَقَّهَ کے معنی ہیں اس علم کو طلب کیا پھر اس میں خصوصیت پیدا کی۔ (غ)

یہ عجیب بات ہے کہ اس سورت کے نزول کے ساتھ جس میں جنگوں کا مضمون اس قدر بھرا ہوا ہے فی الحقیقت **جنگوں کا خاتمہ ہوا** اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے پاس مختلف اقوام عرب کے وفد آنے شروع ہوئے۔ وہ قومیں جو اب تک اسلام کی تباہی پر تلی ہوئی تھیں انہوں نے بھی جب دیکھا کہ اسلام کی قوت کو وہ توڑ نہیں سکتے تو ٹھنڈے دل سے اسلام کی صداقتوں پر غور کرنے لگے۔ ان کے سامنے یہ نظارہ تھا کہ کس طرح محمد رسول اللہ ﷺ ایک اکیلے شخص تھے سارا عرب آپ کا مخالف ہی نہیں خطرناک دشمن تھا۔ جان لینے کے درپے تھا۔ منصوبے کیے، کوشش کی، لڑائیاں کیں مگر اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور اب غزوہ تبوک کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان قیصر روم کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں تو انہوں نے مقابلہ کو چھوڑ دیا اور دل ان کے پہلے سے اندر سے کھائے ہوئے تھے۔ پس قوم پر قوم آنے لگی اور اسلام کے اصول معلوم کر کے دین اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ ان مختلف اقوام کی تعلیم کا ایک انتظام تو یہ ہو سکتا تھا کہ جو مسلمان نبی کریم ﷺ کی صحبت میں رہ کر تعلیم حاصل کر چکے تھے وہ باہر نکل جائیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سب کے سب ہی باہر نکل جاتے۔ اس لیے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ ہر ایک قوم میں سے کچھ آدمی مدینہ میں آ کر تعلیم حاصل کریں اور پھر یہی لوگ جا کر اپنی قوم کو تعلیم دیں جو ان میں سے مسلمان ہو گئے تھے ان کو اسلام کی تعلیم دیں اور جو مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کو اسلام کی طرف بلائیں۔ ﴿وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی قوموں کا بڑا حصہ کفر پر تھا گو ان میں سے تھوڑے لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں دین اور علم کے تمام اقوام میں پھیلانے کا یہی بہترین ذریعہ تھا۔ اگر اہل مدینہ ہی اس کام کے لیے مخصوص رہتے تو دوسری قومیں سمجھتیں کہ علم انہی کا خاص ورثہ ہے۔ مگر دین اور علم کی اشاعت میں اسلام کی تعلیم جمہوریت کے لیے یہ خلاف تھا اس لیے حکم دیا کہ سب قومیں تعلیم حاصل کریں اور اس کا طریق یہ ہے کہ ہر قوم میں سے کچھ آدمی آ کر علم سیکھ جائیں اور پھر اپنی قوم کو جا سکھائیں۔ یوں جنگوں کا خاتمہ اور صلح اور امن کی بنیاد رکھا جانا اسلام کی فتوحات حقیقی کی ابتدا تھی۔ اور جنگوں کے خاتمہ پر اس آیت کو لا کر اسلام کی اصل غرض بھی بتا دی۔ آج بھی اسلام کو ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو دین میں تفقہ حاصل کر کے دنیا کی مختلف قوموں کی طرف نکل جائیں اور جب ان قوموں سے کچھ لوگ اسلام لے آئیں تو پھر وہی لوگ دین اسلام کو سیکھ کر اپنی اپنی قوم کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا قدم نہ اٹھے گا اسلام بھی دنیا میں نہیں پھیل سکتا۔

1363 - **قریب کے کفار سے جنگ** : ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾ عام حکم نہیں جس سے پہلے احکام قتال کے متعلق

وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب کوئی سورت اترتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھایا ہے۔ سو جو ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا اور وہ خوش ہوتے ہیں۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کی پلیدی پر پلیدی کو زیادہ کیا اور وہ مر گئے اور وہ کافر ہی رہے۔ (1364)

اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور کیا دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال میں ایک بار یا دو بار آزمائے جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ (1365)

---

منسوخ ہو جاتے ہوں۔ مثلاً جن کفار کے ساتھ معاہدات تھے ان کے متعلق خود حکم دے چکا ہے کہ ان عہدوں کو پورا کرو یہی تقویٰ ہے۔ پھر یہودی خیبر میں رہے حالانکہ کافر تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے جنگ نہیں کی اور ایک یہود پر کیا انحصار ہے۔ بہتیرے قبیلے اور قومیں تھیں جن کے خلاف آپ نے جنگ نہیں کی۔ پس یہ حکم بھی قتال کے اس پہلے حکم کے ماتحت ہے جو درحقیقت تمام احکام قتال پر حاوی ہے یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ پھر ﴿الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ﴾ کہنے کی ضرورت کیا تھی۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو دکھ اور تکلیفیں انہی لوگوں سے پہنچتی تھیں جو قریب تھے، دور والوں نے دکھ کیا دینا تھا۔ اسی طرف ﴿الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ﴾ میں اشارہ کیا ہے اور غِلْظَةً پر [دیکھو نمبر: 1321]۔ مراد یہ ہے کہ محض قرب کے لحاظ سے قوم کی مصیبت کو نہ بھول جاؤ۔

1364 - رجس یا پلیدی ان کا نفاق ہے جیسا کہ ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ سے ظاہر ہے اور پہلی آیت میں مومنوں کے ایمان کے بڑھنے کا ذکر ہے اس کے مقابلہ پر یہاں ان کے نفاق کے بڑھنے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کے نزول سے بالخصوص ان سورتوں کے نزول سے جن میں جنگ اور دشمن کے مقابلہ کا یا منافقوں کے نفاق کا ذکر ہوتا جس طرح مومنوں کا ایمان ترقی کرتا اسی طرح منافقوں کا نفاق ترقی کرتا۔

1365 - **منافقوں کو نصیحت کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں:** کس قسم کا فتنہ یعنی آزمائش یا دکھ مراد ہے؟ بعض نے کہا قحط اور

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور جب کبھی کوئی سورۃ اترتی ہے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، کیا تمہیں کوئی دیکھتا ہے؟ پھر پھر جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ (1366)

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

یقیناً تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا ہے۔ تمہارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہارے لیے (بھلائی کا) خواہش مند ہے۔ مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔ (1367)

---

بیماریاں، بعض نے کہا غزوات اور جہاد۔ يُفْتَنُوْنَ کا لفظ زیادہ تر پہلے پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ بھوک، بیماری وغیرہ سے جو انسان کو تکلیف پہنچتی ہے، فطرت کا تقاضا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو۔ انسان گناہ سے توبہ کرے۔ مگر ان منافقوں کی حالت ایسی تھی کہ اس سے بھی فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور غزوات اور جہاد کے ذریعہ سے بھی آزمائش تھی۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس انتظار میں رہتے تھے کہ ان جنگوں میں مسلمان مارے جائیں گے، مگر ہر جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کامیابی اور دشمن کی نامرادی ہوتی تھی اور يُفْتَنُوْنَ میں جس دکھ کا ذکر ہے وہ جنگوں کی صورت میں یہ تھا کہ کچھ اموال ان منافقوں کے بھی خرچ ہوتے تھے اور کچھ لوگ بھی ان میں سے شریک جنگ ہو کر مارے جاتے تھے۔

1366- سورت کے نزول سے مراد یہاں ایسی سورت کا نزول معلوم ہوتا ہے جس میں منافقوں کا ذکر ہو اور ان کا ایک دوسرے کی طرف دیکھنا یا تو اس غرض سے ہے کہ اب یہاں سے چلنا چاہیے اور یا بطور تمسخر آنکھوں سے اشارہ کرنا مراد ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا کیونکہ وہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

1367- ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ﴾ عَزَّ کے معنی ہیں غَلَبَ یعنی غالب ہو۔ اور [عَزَّ عَلَيْهِ كَذَا] کے معنی ہیں صَعُبَ وہ چیز اس پر شاق گزری۔ (غ)

﴿مَا عَنِتُّمْ﴾ یعنی عَنِتُّكُمْ، عَنِتَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 283]۔ مشقت، فساد، ہلاکت، گناہ، غلطی سب پر بولا جاتا ہے۔ (ر)

## قلب رسول کی اصلی کیفیت:

یہاں سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس میں کچھ جنگوں کا ذکر ہے، کچھ منافقوں کا ذکر ہے۔ اس لیے آخر پر بتایا کہ یہ کوئی رسول کے

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ ع 16 7 5

سو اگر پھر جائیں تو کہہ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا اور وہ عرش عظیم والا رب ہے۔ (1368)

---

آنے کی غرض نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ رسول کی حالت تو یہ ہے کہ جو کچھ تم پر تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ اس پر بھی شاق گزرتی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ تم ان مصائب سے باہر نکل جاؤ اور وہ تم پر حریص ہے یعنی تمہاری بہتری کو چاہتا ہے۔ یہاں تک لفظ عام ہیں یعنی جو کچھ دنیا میں گناہ اور غلطیاں ہیں اور جو کچھ ان کی وجہ سے دنیا اپنے آپ کو مشقت اور ہلاکت میں ڈال رہی ہے اس سے رسول اللہ ﷺ کا دل پگھلتا ہے۔ جنگ میں انسانوں کا خون بہتا ہے اس سے اسے خوشی نہیں ہوتی۔ اگر لوگ کفر اور نفاق اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں تو اس سے اسے راحت نہیں ہوتی بلکہ ان چیزوں کو دور کرنے کی تڑپ اس کے دل میں ہے۔ اس آخری پیغام میں رسول کے قلب کی پہلی حالت کا ذکر کیا جو دنیا میں گناہ اور ہلاکت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور خدا سے مدد چاہی اور ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾﴾ میں بتایا کہ اگر تم مومن بن جاؤ تو پھر وہ رسول تو تمہارے لیے مجسم راحت و رحمت ہی ہے۔ صرف جب لوگ شرارت میں حد سے بڑھے تو ضرورت وقتی کے لحاظ سے حق کو تباہی سے بچانے کے لیے اسے تلوار اٹھانی پڑی۔ رَءُوْفٌ اور رَاْفَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 180]۔ رَاْفَةٌ کو رَحْمَةٌ پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رَاْفَةٌ میں دفع مضرت ہے اور رَحْمَةٌ میں جلب نفع۔ (ر)

1368- ﴿رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ عرش کے لیے [دیکھو نمبر: 1095]۔ یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے ﴿رَبِّ الْعِزَّةِ﴾ میں یعنی یہ اضافت اختصاص کی ہے۔

ان لوگوں کو جن سے جنگ تھی یا جن کا ذکر اس سورت میں ہے یعنی کافر اور منافق یہ بتایا ہے کہ اصل وہ کون سی تڑپ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں ہے۔ جب یہ بتایا کہ رسول صرف تمہاری خیر خواہی چاہتا ہے تو اب رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی کہ اگر باوجود اس کے کہ تم صرف ان کو دکھوں اور ہلاکت سے نکالنا چاہتے ہو اور ان کی بھلائی چاہتے ہو پھر بھی یہ تمہیں قبول نہ کریں اور تمہاری مخالفت پر اڑے رہیں تو تم کوئی پروا مت کرو۔ ﴿فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ﴾، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے۔ ایک اللہ پر ہی اپنا بھروسہ رکھو۔ بعض روایات میں ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں سب سے آخر نازل ہوئیں۔ مگر بخاری نے ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ﴾ [البقرة: 2:281] ''اور اس دن سے بچاؤ کر لو جس میں تم لوٹائے جاؤ گے۔'' کو آخر ﴿بِمَآ اَنْزَلْتُ﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ ہاں سورۂ توبہ آخری سورتوں میں سے ہے اور روایت کا مطلب شاید یہی ہو کہ سورۂ توبہ میں سب سے آخر ان کا نزول ہوا۔

# سورۃ یونس

## نام:

اس سورت کا نام یونس ہے اور اس میں 11 رکوع اور 109 آیات ہیں۔ اس کا نام یونس اس بات کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم آخر ایمان لا کر ہلاکت سے بچ گئی تھی ویسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم سے ہوگا یعنی یہ قوم تباہ نہ کی جائے گی بلکہ آخر راہِ راست پر آ جائے گی۔

## خلاصہ مضمون:

اس سورت میں زیادہ تر توجہ اللہ تعالیٰ کے رحم کی طرف دلائی ہے کہ وہ کس طرح مصائب میں انسان پر رحم فرماتا ہے اور کفار کو اللہ تعالیٰ کے بے انتہا رحم سے فائدہ اٹھانے کی نصیحت کی ہے۔

① پہلے رکوع میں وحی الٰہی کا ذکر کیا اور بتایا کہ صرف اس دنیا کی زندگی پر خوش نہ ہو جانا چاہیے اور اسی کو غرض و غایت نہ سمجھ لینا چاہیے بلکہ اصل زندگی انسان کی دوسری ہے اور اسی کی طرف وحی الٰہی ہدایت کرتی ہے۔

② دوسرے رکوع میں وحی الٰہی کی تکذیب اور اس پر عذاب کے آنے کا ذکر ہے۔

③ تیسرے رکوع میں بتایا کہ تم پر چھوٹے چھوٹے دکھ اور تکلیفیں آتی ہیں اور تکلیف کے وقت فطرت انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے۔ پس تم بھی ان مصائب سے یہ فائدہ اٹھاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرو اور جب آرام ملے تو خدا کو بھول نہ جاؤ۔

④ چوتھے میں ہستی باری اور توحید پر دلائل دیئے ہیں۔

⑤ پانچویں میں پھر تکذیب پر عذاب کا ذکر کیا ہے۔

⑥ چھٹے میں بتایا کہ قرآن شریف تو تمہیں بلند مقامات کی طرف لے جاتا ہے تم اس کی تکذیب کرنے کی بجائے ان مقامات عالیہ کی طرف رخ کیوں نہیں کرتے۔

⑦ ساتویں میں مومنوں کے مقامات عالیہ کا ذکر کیا۔

⑧ آٹھویں میں حضرت نوح علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی مثالیں پیش کیں۔

⑨ نویں میں فرعون کی تباہی کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس قدر سخت انسان بھی جب آخر ہلاکت کا نشان اس پر آیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا، مگر وہ جھکنا بعد از وقت تھا۔ تم قبل از وقت اس مثال سے فائدہ اٹھاؤ اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ اس کی لاش کو ہم نے نشان کے

طور پر رکھنے کے لیے سمندر سے باہر نکال پھینکا اور یہ خبر قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ اس وقت کسی کو اس بات کی خبر نہ تھی اور آج واقعات نے ثابت کر دیا کہ واقعی وہ لاش محفوظ ہے۔

⑩ دسویں میں بتایا کہ اگر تم اب بھی تکذیب سے رک جاؤ تو عذاب ٹل سکتا ہے اور

⑪ گیارھویں میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا ذکر کر کے سورت کو ختم کیا۔

## تعلق اور ترتیب:

اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے یہ ہے کہ اس کا خاتمہ اس بات پر کیا تھا کہ یہ رسول جو تمہارے پاس آیا تو تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اسے رنج ہوتا ہے۔ اس لیے اس سورت میں بتایا کہ گو وحی الٰہی کی تکذیب اور ساری ہمت اس دنیا پر صرف کر دینے پر عذاب کا آنا لازمی ہے تاہم اللہ تعالیٰ کا رحم بھی بے انتہا ہے۔ اگر انسان ذرا بھی اس کی طرف متوجہ ہو تو وہ بھی اس پر رحمت سے متوجہ ہوتا ہے۔ پچھلی سورت میں زیادہ تر کفار کی سزا کا ذکر تھا تو اس سورت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم غالب ہے بشرطیکہ کوئی فائدہ اٹھانے والا ہو۔ عامہ ترتیب قرآن شریف میں یہ سات سورتیں یعنی یہاں سے لے کر النحل تک قریباً ایک ہی مضمون کی ہیں اور ان میں اثبات نبوت ہے۔ گویا سورہ الاعراف میں جو اثبات نبوت پر ہے انبیاء کی تکذیب کا ذکر کیا تو اس کے بعد [اَلْاَنْفَال] اور [اَلْبَرَاۃ] میں آنحضرت ﷺ کے مخالفین کی سزا کا کچھ ذکر کر کے پھر اسی اصل مضمون اثبات نبوت کی طرف توجہ کی اور سلسلہ مضمون کو جاری رکھا۔ بلحاظ نزول **یہ ساتوں سورتیں یعنی یونس سے لے کر النحل تک ایک ہی زمانہ کی ہیں** اور یہ آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی کا پچھلا زمانہ ہے جب کفار کی مخالفت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ان میں پیشگوئیوں کے رنگ میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ آخر حق غالب آئے گا اور باطل ہلاک ہو جائے گا۔

## اٰيَاتُهَا 109 (10) سُوۡرَةُ يُوۡنُسَ مَكِّيَّةٌ (51) رُكُوۡعَاتُهَا 11

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

المنزل 3

الٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ ① — میں اللہ دیکھتا ہوں (1369) یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ (1370)

---

1369 - ﴿الٓرٰ﴾۔ مقطعات کے لیے [دیکھو نمبر: 8]۔ یہ مجموعہ حروف اس سورت کے علاوہ چار اور سورتوں کی ابتدا میں آتا ہے۔ یعنی [ہود: 11، یوسف: 12، ابراہیم: 14، الحجر: 15] اوران چاروں کے درمیان سورہ [الرعد: 13] ہے جو ﴿الٓمّٓرٰ﴾ سے شروع ہوتی ہے۔ ان چھ سورتوں کا مضمون بھی ملتا جلتا ہے اور زمانہ نزول بھی قریباً ایک ہی ہے۔ یہ حروف [اَنَا اللّٰهُ اَرٰى] کے قائم مقام ہیں جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ (ج) اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کی صفت لانے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق جزا دے گا۔

1370 - ﴿الۡحَكِيۡمِ﴾۔ یہاں کتاب کی صفت ہے حِكۡمَةٌ اور اَلۡحَكِيۡمُ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 50، 164، 321]۔ قرآن کریم کو حکیم اس لیے کہا کہ اس میں حکمت ہے اور بعض نے حکیم سے مراد محکم لیا ہے اور دونوں باتیں درست ہیں کیونکہ وہ محکم بھی ہے اور حکم کے لیے فائدہ دینے والا ہے اور حُكۡمٌ حِكۡمَةٌ سے وسیع ہے ہر ایک حکمت حُكۡمٌ ہے مگر ہر حکم حکمت نہیں۔ کیونکہ حکم صرف یہ فیصلہ کرنے کا نام ہے کہ یہ چیز یوں ہے یوں نہیں۔ اور حکمت یہ ہے کہ علم اور عقل سے حق کو یعنی صحیح بات کو پا لے۔ (غ)

یہاں قرآن کریم کو ﴿الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ﴾ فرمایا، دوسری جگہ بھی ہے ﴿وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَكِيۡمِ ۙ﴾ [يٰسٓ: 2:36] ''حکمت والا قرآن گواہ ہے۔'' اور ایک جگہ آتا ہے ﴿حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ﴾ [القمر: 5:54] ''کامل دانائی (کی باتیں)۔'' اور کئی جگہ پر کتاب کے مقابل پر حکمت کا ذکر کیا ہے جیسے ﴿يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ﴾ [الجمعة: 2:62] ''انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔'' ﴿وَ اذۡكُرۡنَ مَا يُتۡلٰى فِيۡ بُيُوۡتِكُنَّ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الۡحِكۡمَةِ﴾ [الأحزاب: 34:33] ''اور اسے یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور حکمت سے پڑھا جاتا ہے۔'' تو یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ یہ ساری کتاب حکمت سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں، یعنی اس میں جو کچھ ہے وہ حق ہے اور علم اور عقل کے مطابق ہے اور پھر اس کی بعض باریک حکمت کی باتوں کو فہم رسول نے الگ کر کے کھول دیا تو وہ بھی حکمت ہے۔ اور قرآن حکیم کہنے میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ مذہب کی بنا اصل میں حکمت پر ہے اور یہ ایک سائنس ہے جس کے قوانین اور قواعد عقل و علم کے مطابق ہیں۔ چند بے جوڑ باتوں کا نام مذہب نہیں جیسا کہ پہلے لوگوں نے خیال کر رکھا تھا۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲

کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک مرد کی طرف وحی کی کہ لوگوں کو ڈرا اور انہیں خوش خبری دے جو ایمان لائے کہ ان کے لیے رب کے ہاں راستی کو قدم ہے۔ کافروں نے کہا یہ تو صریح جادوگر ہے۔ (1371)

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ

تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر غالب ہے۔ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کے حکم کے بعد۔ یہ اللہ تمہارا رب ہے

---

1371 - ﴿قَدَمَ صِدْقٍ﴾۔ قَدَمٌ پاؤں کو کہتے ہیں اور اس سے مراد تقدم و تاخر لیا جاتا ہے جو باعتبار زمانہ بھی ہوتا ہے اور باعتبار شرف بھی۔ (غ) یعنی قدم سے مراد یہاں مجازاً سبقت ہے اور وہ سبقت بلحاظ شرف وفضیلت ہے اور صِدْقٌ کا استعمال قول پر عام ہے مگر کِذْبٌ کی طرح افعال جوارح میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور ہر ایک فضیلت والے فعل کو ظاہری ہو یا باطنی صدق کہا جاتا ہے ﴿فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵﴾ [القمر: 55:54] ''راستی کے مقام میں، قدرت والے بادشاہ کے پاس۔'' ﴿رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ﴾ [بنی إسرائیل: 80:17] ''اے میرے رب! مجھے سچائی کے داخلہ سے داخل کیجیو اور سچائی کا نکلنا نکالیو۔'' ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝۸۴﴾ [الشعرآء: 84:26] ''اور میرے لیے پچھلوں میں ذکر خیر جاری رکھ۔'' اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے صالح بنائے تاکہ جو لوگ بعد میں اس کی ثنا کریں وہ ثنا سچ ہو جھوٹ نہ ہو۔ (غ) اور ﴿قَدَمَ صِدْقٍ﴾ سے مراد فضیلت میں قدم آگے بڑھانا ہے۔ (غ) اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں جو قدیم کا لفظ متکلمین میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے تو امام راغب کہتے ہیں کہ قرآن اور آثار صحیح میں اس کا کچھ اثر نہیں پایا جاتا۔

اس بات کے بیان کو کہ بدی کا انجام بد ہے اور نیکی کرنے والے ترقی کریں گے سن کر سحر قرار دیتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو ساحر کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر اور ساحر کا استعمال قرآن مجید میں کس رنگ میں ہوا ہے۔ مخالفین انبیاء کو ان کے معجزات کی وجہ سے ساحر نہیں کہتے بلکہ ان کے حسنِ بیان کی وجہ سے ساحر کہتے ہیں۔ بات تو صاف تھی دلوں پر اثر کرتی تھی۔ مگر اس سے بچنے کے لیے کہتے تھے ساحر ہے اس کی باتوں کا اعتبار نہ کرو۔

فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

سو اس کی عبادت کرو تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (1372)

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴

اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے وہی مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا تاکہ انہیں جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں انصاف کے ساتھ بدلہ دے اور جو کافر ہیں ان کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہے، اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔ (1373)

---

1372 - ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ اور عرش اور تدبیر امر پر [دیکھو نمبر: 1094 ,1095]۔ پہلی آیت میں وحی الٰہی کا ذکر تھا جو بدی اور نیکی کی جزا کو ضروری قرار دیتی ہے اور اس کے لیے ایک دوسری زندگی کا وعدہ دیتی ہے۔ اس پر کفار کو تعجب ہوتا تھا۔ تو عظمت الٰہی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا وہ دوسری خلق پر قادر نہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۵﴾ [قٓ: 15:50] ''تو کیا ہم پہلی پیدائش میں تھک گئے؟ بلکہ وہ نئی پیدائش کے متعلق شبہ میں ہیں۔'' انسان کی عقل اور اس کا علم تو اس موجودہ مخلوق کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے تو اور خلق کے انکار کے کیا معنی۔ اور چھ وقتوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ خلق بھی بتدریج ہوئی وہ دوسری خلق بھی بتدریج ہوگی۔ اور شفیع کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ پیدا کرنے والا وہ ایک ہے کوئی اس کے ساتھ شامل نہیں۔ کیونکہ شفع وتر کے مقابل پر ہے۔ پس اور کوئی مستحق عبادت بھی نہیں۔ ﴿اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ﴾ میں دوسری شفاعت کی طرف بھی اشارہ ہے جو گنہگاروں کے لیے ہوگی اور اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ جو اور اس کے شفیع سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس کی مخلوق ہے۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے خالق ہونے کی طرف توجہ دلانے میں اصل غرض دوسری زندگی کی طرف توجہ دلانا ہے، اگلی آیت سے ظاہر ہے۔

1373 - یہاں پچھلی آیت کے اشارہ کو واضح کر دیا ہے اور ﴿وَعْدَ اللّٰهِ﴾ اس وعدہ کے لیے بطور مصدر مؤکد ہے جو ﴿اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا﴾ میں پایا جاتا ہے اور حَقًّا وعد اللہ کی تاکید کے لیے ہے۔ اور ﴿اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ سے مراد موت کے بعد بعث کے ذریعہ لوٹ کر جانا ہے اور یہی وعدہ حق ہے ورنہ موت کو تو سب جانتے ہیں اور آگے پہلی پیدائش کا ذکر کیا اور اس دوبارہ پیدائش کی غرض یہ بتائی کہ نیک اور بدعمل کرنے والے اس کے مطابق پھل پائیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵

وہی ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں۔ تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان لو، اللہ نے یہ حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے وہ ان لوگوں کے لیے کھول کر باتیں بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔ (1374)

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝۶

رات اور دن کے ادل بدل میں اور (اس میں) جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں۔

---

1374 - ﴿ضِیَآءً﴾۔ ضَوْءٌ وہ ہے جو روشنی کرنے والے اجسام سے پھیل جاتی ہے۔ آگ کی روشنی پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ (غ) اور بعض نے ضَوْءٌ اور نُورٌ کو مترادف کہا ہے اور بعض نے نزدیک ضَوْءٌ وہ ہے جو بالذات ہو جیسے سورج اور آگ اور نور وہ ہے جو بالعرض ہو اور دوسرے سے حاصل کیا گیا ہو۔ (ت) جیسے چاند کی روشنی۔ قرآن کریم نے یہاں یہی فرق رکھا ہے اور دوسری جگہ آگ کے متعلق ہے ﴿فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ [البقرة: 17:2] ''پھر جب اس (آگ) نے جو کچھ اس کے گرد تھا روشن کر دیا۔'' اور ﴿یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾ [النور: 35:24] ''قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی دے گو اسے آگ بھی نہ چھوئے۔'' کے معنی بعض نے یوں کیے ہیں کہ یہ آنحضرت ﷺ کے لیے بطور مثال ہے: [یَكَادُ مَنْظَرُهٗ یَدُلُّ عَلٰی نُبُوَّتِهٖ وَإِنْ لَّمْ یَتْلُ قُرْآنًا] (ت) یعنی آپ کا منظر ہی آپ کی نبوت پر دلالت کرتا تھا۔ گو آپ قرآن نہ پڑھتے اور حدیث میں جو آتا ہے [لَا تَسْتَضِیْئُوا بِنَارِ أَهْلِ الشِّرْكِ] (شعب الإیمان للبیهقی، جلد7، صفحہ 40) جس کے لفظی معنی ہیں مشرکوں کی آگ سے آگ روشن نہ کرو۔ تو مراد اس سے صرف یہ ہے کہ اپنے معاملات میں مشرکوں کو مشیر نہ بناؤ اور ان کی رائیں نہ لو۔ (ت) نور کے لیے [دیکھو نمبر: 580]۔

﴿مَنَازِلَ﴾۔ مَنْزِلٌ یا مَنْزِلَةٌ جائے نزول کو کہا جاتا ہے اور مرتبہ اور درجہ کو بھی کہا جاتا ہے۔ (ل) ﴿قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ﴾ کے معنی ہوں گے اس کا اندازہ کیا کئی منزلیں یعنی اسے منزلوں والا بنایا اور منزلوں سے مراد اس کا بڑھنا گھٹنا ہے۔

اس ظاہری نظام کو جس پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے بیان کرنا اس غرض سے ہے کہ عالم جسمانی سے عالم روحانی کے نظام کی طرف توجہ دلائی جائے جیسا اگلی آیت سے ظاہر ہے اور بتایا جائے کہ وہ خدا جس نے انسان کی حیوانی زندگی کے لیے یہ سامان

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۙ﴿۷﴾

جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی ہیں اور اسی پر مطمئن ہو گئے ہیں اور وہ جو ہماری آیتوں سے بے خبر ہیں۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸﴾

ان کا ٹھکانا آگ ہے اس کا بدلہ جو وہ کماتے تھے۔[1375]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۹﴾

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے انہیں راہ دکھائے گا نعمتوں والے باغوں میں ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔[1376]

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ

اُن میں اُن کی دعا ہے اے اللہ تو پاک ہے اور ان میں اُن

---

پیدا کیے ہیں اسی نے روحانی زندگی کے سامان بھی پیدا کیے ہیں۔

1375- دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اسی حیوانی زندگی کو ہی اصل زندگی قرار دیا جائے اور کھانے پینے اور آسائش جسمانی کو ہی مقصد زندگی سمجھ لیا جائے۔ ایسے لوگ حقیقی راحت کو کبھی نہیں پاتے۔ جب اس دنیا میں بھی نہیں پاتے تو آخرت میں کہاں پائیں گے۔

1376- ہدایت کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 5]۔ بِاِيْمَانِهِمْ یعنی وہ ایمان ہی ان کے لیے اس منزل مقصود تک پہنچنے کا موجب ہو جاتا ہے۔ گویا **بغیر ایمان کے انسان منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا**۔ یہی ایمان انسان کے لیے نور بن جاتا ہے اس دنیا میں بھی جیسا کہ فرمایا ﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرة: 257:2] ''وہ ان کو سخت اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔'' اور آخرت میں بھی ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾ [الحديد: 12:57] ''جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا ان کا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہوگا۔'' مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عمل صالح کوئی چیز نہیں بلکہ عمل صالح کی توفیق ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ایک روشنی ہے، صرف روشنی فائدہ نہیں دیتی جب تک انسان اس میں چلے نہیں۔

فِيۡهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعۡوٰىهُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ ع 1/10/6

کی آپس کی دعا سلام ہے اور ان کی آخری دعا ہے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔(1377)

وَ لَوۡ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَهُمۡ بِالۡخَيۡرِ لَقُضِىَ اِلَيۡهِمۡ اَجَلُهُمۡ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۞

اور اگر اللہ لوگوں پر مصیبت جلد بھیجے جیسے وہ بھلائی کو جلد چاہتے ہیں تو ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ سو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہم ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے چھوڑ دیتے ہیں۔(1378)

---

1377- **مومن کے منہ سے تو اس زندگی میں بھی یہی کلمات نکلتے ہیں:** ﴿سُبۡحٰنَكَ اللّٰهُمَّ﴾ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞﴾ [الفاتحة: 1:1] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب۔'' پانچ وقت کی نماز میں یہی بار بار کہتا ہے۔ مسلمان مسلمان سے ملتا ہے تو اسے سلامتی کی دعا دیتا ہے اور عملاً بھی اس کی سلامتی کا خواہاں ہوتا ہے [اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ.] (صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، حديث: 10) ''مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔'' پس <u>مومن کا بہشت</u> اسی دنیا کی زندگی سے شروع ہوتا ہے اور جنات نعیم کا نقشہ یہاں کیا لطیف کھینچا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد اور ایک دوسرے پر سلامتی۔

1378- اَجَلٌ۔ اصل میں تو کسی چیز کے لیے مدت معینہ کو کہا جاتا ہے اور اس سے مراد موت بھی لی جاتی ہے کیونکہ اس سے دنیا میں بقا کی مدت پوری ہو جاتی ہے۔ (غ) اور یہاں چونکہ قوم کا ذکر ہے اس لیے مراد قوم کی ہلاکت ہے۔

**برائی مانگنے کی ممانعت:**

جب کفار کو ان کے بدکرداریوں کے انجام سے ڈرایا جاتا تھا تو کہتے تھے وہ عذاب آتا کیوں نہیں۔ اسی کی طرف اس سوال میں اشارہ ہے جو بار بار کرتے تھے ﴿مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ﴾ [يونس: 48:10] ''یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟'' ﴿مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ﴾ [السجدة: 28:32] ''یہ فیصلہ کب ہوگا؟'' اور ایک جگہ ہے ﴿اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۞﴾ [الأنفال: 32:8] ''اے اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب بھیج۔'' اسی طرح وہ عذاب بار بار مانگتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دکھ اور تکلیف کو جلد نہیں بھیجتا گو انسان اپنی بیوقوفی سے اس کے لیے جلدی کرتا ہے جس طرح بھلائی کے لیے جلدی کرتا ہے۔ کفار تو عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے۔ مگر آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ذرا ذرا باتوں پر اپنے ہی عزیزوں کے لیے عذاب مانگتے ہیں یا کوئی اپنے بچے پر خفا ہوتا ہے تو اس کے لیے موت مانگتا ہے۔ کسی کو اپنے بھائی سے ذرا اختلاف ہوتا ہے تو اس کے لیے

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب انسان کو دکھ پہنچتا ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے اپنی کروٹ پر یا بیٹھا یا کھڑا۔ پھر جب ہم اس کا دکھ دور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے گویا کہ ہمیں کسی دکھ کے لیے جو اسے پہنچا ہو پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح خطا کاروں کو بھلا معلوم ہوتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (1379)

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا، جب انہوں نے ظلم کیا اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لے کر آئے اور نہ تھے کہ ایمان لاتے، اسی طرح ہم مجرم لوگوں کو سزا دیتے ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

پھر ہم نے ان کے بعد تمہیں زمین میں جانشین بنایا تا کہ ہم دیکھیں تم کیا کرتے ہو۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآىِٕ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ

اور جب ان پر ہماری کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں تو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں اس کے سوا کوئی اور قرآن لا یا اسے بدل دے۔ کہہ میرا کام نہیں کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں۔ میں تو کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں

---

بددعاؤں پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی رحمت کو چاہیں اپنے لیے دکھ اور تکلیف نہ چاہیں۔

1379 - اس آیت میں بتایا کہ دکھ تو مانگتے ہیں لیکن دکھ پہنچتا ہے تو پھر خدا کو پکارتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا کہ دکھ ہم اس لیے بھیجتے ہیں تا کہ انسان اپنی اصلاح کرے مگر انسان جلد بھول کر پھر خطا کاری کی طرف چلا جاتا ہے۔

عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑮

اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (1380)

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑯

کہہ اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ وہ تمہیں اس کا علم دیتا۔ میں تو تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ (1381)

---

1380 - نَشْاَةٍ ثَانِيَة یعنی دوسری زندگی جو ہر عمل کی جزا و سزا کو ضروری ٹھہراتی ہے اور جس کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کو اپنے ہر عمل کے نتیجہ پر پہلے غور کرنا چاہیے۔ دنیا پرست لوگوں کے لیے جو خواہشات حیوانی سے اوپر اٹھنا نہیں چاہتے نا قابل قبول چیز ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ **یہ قرآن جو ایک دوسری زندگی پر اس قدر زور دیتا ہے اسے ہم قبول نہیں کر سکتے**۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ان کے کاہن ان کے حسب منشا باتیں عالم بالا کی بیان کر دیتے ہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ کریں اور ان کے کھانے پینے، شہوات محبت دنیا وغیرہ امور میں کوئی دخل نہ دیں۔ نہ ان کی بت پرستی کو برا کہیں۔ جواب کیا لطیف دیا ہے۔ میں تو خود صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ اگر یہ میری بنائی ہوئی بات ہوتی تو میں خود اس پر کیوں عمل کرتا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ **آنحضرت ﷺ تمام احکام قرآنی کی تعمیل کرتے تھے اور سوائے وحی کے اور کسی چیز کی پیروی نہ کرتے تھے**۔ اس لیے تفصیلات شریعت کے دینے میں بھی آپ نے اتباع وحی الٰہی ہی کیا۔

1381 - ﴿اَدْرٰىكُمْ﴾۔ دَرَيْتُ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کی معرفت حاصل کی اور اَدْرَيْتُهٗ کے معنی ہیں دوسرے کو اس کا علم دیا [اَدَارَهٗ بِهٖ، اَعلَمَهٗ.] (ل) ﴿لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ [الطلاق: 1:65] ''تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔'' ﴿وَ اِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ﴾ [الأنبیآء: 111:21] ''اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لیے آزمائش ہو۔'' ﴿وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ﴾ [المرسلات: 14:77] ''اور تجھے کیا معلوم۔'' ﴿وَ مَا يُدْرِيْكَ﴾ [الأحزاب: 63:33] ''اور تجھے کیا معلوم۔'' اسی مادہ سے مِدَارَاةٌ ہے جس کے معنی حسن خلق اور نرمی ہیں۔

### آنحضرت ﷺ کی صداقت و امانت کا اعتراف:

مطلب یہ ہے کہ وہ تو اس کے ذریعے سے تمہیں گمراہی سے نکال کر دین اور دنیا میں شرف دینا چاہتا ہے اسی لیے اس نے اسے اتارا۔ اور یہ جو فرمایا کہ میں نے تمہارے اندر ایک عمر بسر کی ہے تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے۔ تو یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ کوئی اور قرآن بنا لو یا اسے بدل دو۔ مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بنانا میرا کام نہیں۔ میں نے تمہارے اندر چالیس سال کاٹے ہیں۔ کیا تم نے کبھی میری صداقت اور دیانت و امانت پر حرف رکھا۔ جس شخص نے چالیس سال تک ایسی صداقت اور راستبازی کا نمونہ دکھایا کہ ملک عرب نے اسے الامین کے نام سے پکارا، جس شخص نے اتنی مدت انسان پر جھوٹ نہیں بولا کیا

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کو جھٹلایا۔ مجرم کامیاب نہیں ہوتے۔ (1382)

---

اب ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اتنا بڑا افترا کرے کہ شب و روز جھوٹ باتیں اس کی طرف منسوب کرے اور ایک دن نہیں دو دن نہیں بلکہ برابر سالہا سال تک جھوٹ پر جھوٹ بناتا چلا جائے۔ یہ دلیل ان عربوں کے لیے ہے جو آپ کی چالیس سالہ اخلاق و عادات سے واقف تھے، دلوں کو کھا جانے والی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب ابوسفیان سے ہرقل نے آنحضرت ﷺ کے حالات دریافت کیے اور اس وقت ابوسفیان رسول اللہ ﷺ کے سخت ترین دشمن تھے اور ان پر یہ سوال ہوا کہ [فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَّقُولَ مَا قَالَ؟] (صحيح بخاری، كتاب بدء الوحی، باب6، حديث: 7) یعنی ''کیا اس دعویٰ سے پہلے تم ان پر جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے؟'' تو ابوسفیان نے اقرار کیا کہ ایسا نہ تھا۔ اور ہرقل نے اس سے استدلال کیا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص ایسا راستباز ہو کبھی لوگوں پر جھوٹ نہ بولے، پھر اللہ پر جھوٹ بولے۔ ایسا ہی نجاشی کے سامنے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کفار قریش کے سامنے یہ شہادت دی جس کا وہ انکار نہیں کر سکے [نَعْرِفُ صِدْقَهٗ وَنَسَبَهٗ وَأَمَانَتَهٗ] (محاسن التأويل، باب 16) ہم آپ کے صدق اور عالی نسبی اور امانت کو پہچانتے ہیں۔ بعض سعید فطرت لوگ آتے اور آپ کی وجہ مبارک کو دیکھ کر پکار اٹھے [لَيْسَ بِوَجْهِ رَجُلٍ كَذَّابٍ] یہ کذاب کا منہ نہیں۔ اس مضمون کو اگلی آیت میں صاف کر دیا ہے جہاں فرمایا ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ [یونس:17] ''تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا'' اللہ پر جھوٹ بنانا سب سے بڑا ظلم ہے۔ جو انسان پر جھوٹ نہیں بناتا وہ اللہ پر جھوٹ بنانے کا مرتکب کیونکر ہوسکتا ہے۔ یہاں قرآن کریم کے اعجاز کا ذکر نہیں۔

1382- **پیشگوئی کہ مفتری اور مکذب فلاح نہیں پاسکتے اور اس کا پورا ہونا:** مکی زمانہ ہے، آنحضرت ﷺ سخت مصائب میں ہیں۔ بات کوئی مانتا نہیں۔ چند ماننے والے یا تکلیفیں اٹھا رہے ہیں یا تتر بتر ہو چکے ہیں۔ مگر اپنی صداقت اور راستبازی پر اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ پر کتنا بڑا ایمان ہے کہ اس وقت فرماتے ہیں کہ ان دونوں گروہوں میں سے یعنی ایک طرف آپ اور ایک طرف آپ کو جھوٹا کہنے والے۔ ایک گروہ نہایت ہی ظالم ہے اور مجرم ہے اور مجرم کو کبھی فلاح نہیں مل سکتی۔ اگر میں نے اللہ پر جھوٹ بنایا ہے تو مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ اگر تم خدا کی باتوں کو جھوٹ قرار دیتے ہو تو تم سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ پھر اس بیکسی کے وقت کے لفظ جب مخالفت کا پورا زور صرف ہو جانے کے بعد اس قدر سچے ثابت ہوئے اور کوئی دنیوی طاقت حق اور صداقت کی رَو کو روک نہ سکی بلکہ اس کی ہر ایک طاقت اس کے سامنے خود بہہ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہی عربوں کو ایک دوسرا نقشہ بھی دکھا دیا کہ جب آپ کی کامیابی کو دیکھ کر مسیلمہ اور اسود نے نبوت کے دعوے کیے تو افترا کرنے والوں کا انجام بد بھی اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچاتا ہے اور نہ انہیں نفع دیتا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ کیا تم اللہ کو ایسی بات بتاتے ہو جو نہ آسمانوں میں اس کے علم میں ہے اور نہ زمین میں۔ وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ (1383)

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں، سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو ان میں ان باتوں کا فیصلہ کر دیا جاتا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ (1384)

---

1383 - عرب کے بت پرست بتوں کو اپنا شفیع سمجھتے تھے یعنی کہتے تھے ہم خدا تک نہیں پہنچ سکتے یہ ہمیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا واسطہ ہیں۔ بعینہ جس طرح آج کثرت سے مسلمان پیروں کو اپنا شفیع سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو سکیں یا اس سے کوئی دعا کر سکیں۔ ان کے پیر ان کے شفیع ہیں۔ ہندوؤں کا عامی عقیدہ تو نہایت سطحی ہے مگر ان کا فلسفیانہ عقیدہ اسی کے قریب قریب ہے۔ وہ بتوں میں اللہ تعالیٰ کا حلول مان کر ان پر اپنی توجہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں اصل غرض ان کی عبادت نہیں خدا کی عبادت ہے۔ مگر چونکہ ایک غیر جسم، غیر مرئی چیز پر ہم اپنی توجہ نہیں لگا سکتے اس لیے ان کو توجہ کے لیے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ بعینہٖ اس کی مثال ہے جو عرب کے بت پرست کہتے تھے ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: 3:39] ''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے نزدیک کر دیں۔'' اللہ کو مان کر ایسی باتوں کو پیش کرنے پر فرمایا کہ تم سمجھتے ہو کہ تم کو بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ کو نہیں۔ اس نے یہ تعلیم آج تک کسی نبی کی معرفت نہیں دی کہ کسی اور کو شفیع بنا کر اس کی عبادت کیا کریں۔ بلکہ وحی الٰہی یہی راہ بتاتی ہے کہ ہر انسان خود ان راہوں پر چل کر جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں قرب الٰہی کا مقام حاصل کر سکتا ہے اور ﴿لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ﴾ میں بتایا کہ جب دنیا میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو اللہ تعالیٰ کے حضور کیا نفع دیں گے۔ عیسائیوں نے بھی حضرت مسیح کو بعینہٖ ایسا ہی شفیع مانا ہوا ہے۔

1384 - **مخالفت کا قانون مستمرہ:** ﴿مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [یونس: 19:10] ''سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں۔'' پر [دیکھو

وَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع 2 10 7

اور کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارا گیا۔ کہہ غیب صرف اللہ کے لیے ہے، سو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (1385)

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور جب ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچتی ہے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ ہماری آیتوں کے حق میں تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ کہہ اللہ سب سے جلد تدبیر کرسکتا ہے۔ ہمارے بھیجے ہوئے لکھتے جاتے ہیں جو تم تدبیریں کرتے ہو۔ (1386)

---

نمبر: 272] مراد یہ ہے کہ جیسے پہلے لوگ تھے ویسے ہی یہ تمہارے مخالف ہیں انہوں نے بھی حق کی مخالفت کی، یہ بھی حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ اختلاف کے اس معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 214]۔ ﴿كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کی سزا کا ایک وقت مقرر ہو چکا ہے وہ جلدی چاہتے ہیں مگر وہ اپنے وقت پر آئے گی۔ یہی مضمون اس رکوع کا ہے اور یوں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب سے آگے ہے [سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي] (صحيح بخاری، كتاب التوحيد، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ..... ، حديث: 7553).

1385 - اٰيَةٌ میں اشارہ اسی نشان ہلاکت کی طرف ہے اور تنکیر عظمت کے لیے ہے۔ اسی لیے جواب دیا کہ وہ نشان تو آ کر رہے گا میں بھی انتظار کرتا ہوں تم بھی کرو۔ ہاں یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کون سا دن اور کون سا وقت ہوگا کیونکہ غیب کی ساری تفصیلات کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

1386 - رحمت سے مراد وسعت آسائش صحت وغیرہ ہیں۔ رحمت کے چکھانے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور دکھ کے متعلق کہا جو انہیں پہنچ جاتا ہے۔ دوسری جگہ ہے: ﴿وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝﴾ [الشعرآء: 80:26] ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ انسان کے لیے رحمت ہی رحمت چاہتا ہے۔ **تکلیف میں بھی راحت پنہاں ہے۔** مگر بجائے اس کے کہ فراخی اور آسائش کی قدر کریں، شکرگزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکیں، اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مَكْرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 443]۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾

وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انہیں اچھی ہوا کی مدد سے لے کر چلتی ہیں اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں انہیں تند ہوا آلیتی ہے اور ہر طرف سے ان پر لہریں چڑھ آتی ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ (ہلاکت میں) گھر گئے۔ اللہ کو اُسی کی خالص فرمانبرداری کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔ اگر تو ہمیں اس سے نجات بخشے تو یقیناً ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ (1387)

---

1387- ﴿عَاصِفٌ﴾۔ نباتات کے تنہ پر جو پتے ہیں اور جو خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتے ہیں انہیں عَصْف کہتے ہیں اور ﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ﴾ [الرحمٰن: 12:55] ''اور بھس والا دانہ۔'' میں عَصْفِ سے مراد وہ چھلکا ہے جو کھانے میں نہیں آتا ﴿كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ﴾ [الفیل: 5:105] ''کھائے ہوئے بھس کی طرح۔'' (ل) اور [رِیْحٌ عَاصِفٌ] یا عَاصِفَة وہ تند ہوا ہے جو چیزوں کو توڑ کر چورا کر دیتی ہے۔ (غ)

﴿اُحِیْطَ بِهِمْ﴾۔ حَاطَ کے معنی ہیں حفاظت کی۔ (ل) اسی سے اِحْتِیَاطٌ ہے اور اسی سے حَائِطٌ ہے جس کے معنی دیوار ہیں کیونکہ وہ ایک چیز کو گھیر کر اندر لے لیتی ہے اور اِحاطَة کے لیے [دیکھو نمبر: 329] ﴿اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ﴾ [حم السجدة: 54:41] یعنی ''سب جہات سے ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے۔'' اور منع کے معنی میں بھی آتا ہے ﴿اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ﴾ [یوسف: 66:12] ''سوائے اس کے کہ تم سب ہی گھیر لیے جاؤ۔'' اور ﴿اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ﴾ [البقرة: 81:2] ''اس کی برائیاں اُسے گھیر لیتی ہیں۔'' بلیغ استعارہ ہے۔ کیونکہ انسان جب گناہ کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو یہ اسے اس سے بڑے گناہ کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ اور اس طرح گناہ سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے اور ﴿اُحِیْطَ بِهِمْ﴾ میں اور ﴿وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا﴾ [الفتح: 21:48] ''اور اَور (فتوحات) بھی ہیں جن پر تمہیں قدرت نہیں تھی، اللہ نے ان کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔'' میں اور ﴿عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ﴾ [ھود: 84:11] ''گھیر لینے والے دن کے عذاب کے آنے سے۔'' میں [اَحَاطَ بِالْقُدْرَةِ] مراد ہے یعنی اپنی قدرت سے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ (غ) اور جب ایک شخص کی ہلاکت قریب آ گئی ہو تو کہا جاتا ہے [اُحِیْطَ بِفُلَانٍ] جیسے ﴿اُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ﴾ [الکھف: 42:18] ''اس کا مال و دولت تباہ کر دیا گیا۔'' [اَیْ أَصَابَهُ مَآ أَهْلَكَهُ] یعنی ''اسے ہلاکت نے آلیا۔'' (ل) اور یہی مراد یہاں ہے یعنی مراد ہے ہلاکت میں گھر گئے۔

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

پھر جب انہیں نجات دیتا ہے تو وہ زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہاری اپنی ہی جانوں پر ہے دنیا کی زندگی کا سامان (لے لو) پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پھر ہم تمہیں بتائیں گے جو کچھ تم کرتے تھے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

دنیا کی زندگی کی مثال صرف پانی کی طرح ہے جسے ہم بادل سے اتارتے ہیں، پھر اس سے زمین کا سبزہ مل نکلا۔ جسے لوگ اور چارپائے کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین اپنا سنگار کر لیتی ہے اور خوبصورت بن جاتی ہے اور اس کے مالک سمجھتے ہیں کہ وہ اس پر پوری طاقت رکھتے ہیں ہمارا حکم رات یا دن کو اس پر آتا ہے تو ہم اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیتے ہیں گویا کل وہ تھی ہی نہیں۔ اسی طرح ہم باتوں کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔ (1388)

---

جو کچھ اوپر بیان فرمایا تھا اس کی ایک مثال دی ہے کہ کس طرح مصیبت کے وقت انسان خدا کو پکارتا ہے۔ گویا بتایا ہے کہ فطرت انسانی میں یہ بات مرکوز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سہارا تلاش کرے۔ مگر مصیبت سے نکل کر آسائش کی زندگی پھر دل پر غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اور ابتدا تو خطاب سے کی ہے كُنْتُمْ مگر جَرَيْنَ میں غائب کی طرف التفات کلام کر دیا ہے۔ غرض ان کے بُعد کی طرف توجہ دلانا ہے جو آسائش کے وقت انسان کو ہو جاتا ہے اور یا چونکہ مثال میں دکھ تو بعض کا ہے اور مثال کی غرض سب کو سمجھانا ہے۔ اس لیے مخاطب سے غائب کی طرف التفات کیا۔

1388 - ﴿خْتَلَطَ﴾۔ خَلَطَ دو یا زیادہ چیزوں کے اجزا کا جمع کرنا ہے خواہ وہ دونوں سیال ہوں یا دونوں جامد یا ایک سیال اور ایک جامد اور خَلِيْطٌ شریک، ہمسایہ یا دوست کو کہتے ہیں۔ ﴿وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ﴾ [صٓ: 24:38] ''اور بہت سے شریک۔'' اور

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے۔(1389)

---

اسی سے اختلاط ہے۔(غ) مگر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہاں مختلف سبزیوں کا اُگنا مراد لیا ہے۔ گویا وہ ایک دوسرے سے مل جل گئیں۔(ج) اور ایک ہی چیز کا بہت بڑھ جانا بھی مراد ہوسکتا ہے۔ گویا اس کے اجزا ایک دوسرے سے مختلط ہو گئے۔(ر) اس صورت میں باسبب کے لیے ہوگی۔ یعنی بارش کے سبب سے سبزیوں میں بہت نشوونما ہوا۔ اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ زمین کی نبات اس پانی کے ساتھ مل گئی کیونکہ روئیدگی اسی سے پیدا ہوتی ہے کہ پانی کے اجزا سبزیوں کے اجزا سے مل جل جاتے ہیں۔

﴿زُخْرُفَ﴾۔ زُخْرُفٌ زینت کو اور کسی چیز کے حسن کے کمال کو کہتے ہیں۔ اور یہاں مراد زمین کی زینت ہے جو نبات سے اسے ملتی ہے یا اس زینت کا تمام وکمال کو پہنچ جانا۔ اور زخرف سونے کو بھی کہتے ہیں اور ﴿زُخْرُفَ الْقَوْلِ﴾ [الأنعام: 112:6] ایسی باتیں جو خوب سجائی گئی ہوں۔(ل)

﴿حَصِيْدًا﴾۔ حَصَدَ کھیتی کے کاٹنے پر بولا جاتا ہے اور یہی معنی حَصَادٌ کے ہیں ﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ [الأنعام: 141:6] ''اور اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔'' اور یہاں حَصِيْدٌ سے مراد کٹی ہوئی کھیتی ہے جو گویا تباہ کردی گئی۔ اسی معنی میں ہے: ﴿مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ﴾ [هود: 100:11] ''ان میں سے کچھ آباد اور (کچھ) اجڑی ہوئی ہیں۔'' اور ﴿حَبَّ الْحَصِيْدِ﴾ [قٓ: 9:50] میں مراد وہ دانا ہے جو کاٹا جاتا ہے۔(غ)

﴿تَغْنَ﴾۔ غِنًى کے معنی تو عدم حاجت ہیں اور [غِنٰى فِيْ مَكَانِ كَذَا] سے مراد ہے اس مکان میں مدت تک رہا گویا اپنے غیر سے مستغنی تھا۔(ل) ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ [الأعراف: 92:7] ''گویا کہ وہ وہاں بسے ہی نہ تھے۔''(غ) اور یہاں ﴿لَّمْ تَغْنَ﴾ سے مراد ہے گویا کل اس کی نبات تھی ہی نہیں۔

اس مثال میں بھی وہی بات سمجھائی ہے جو پہلی مثال میں تھی۔ زمین کی زینت کے سامان اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہی کرتا ہے۔ مگر **جب لوگ اس آسائش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں** اور اللہ تعالیٰ کی طاقت وقدرت سے غافل ہوکر اپنے آپ کو ہی قادر سمجھ لیتے ہیں ﴿اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَا﴾ تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا دوسرا نظارہ بھی دکھا دیتا ہے تاکہ انسان سمجھ لے کہ اس کی طاقت سب طاقتوں سے اوپر نہیں بلکہ یہ کوئی اور عظیم الشان طاقت ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہی سب کچھ ہے۔

1389- ﴿دَارِ السَّلٰمِ﴾۔ سَلْمٌ اور سَلَامَةٌ کے معنی آفات ظاہری اور باطنی سے پاک ہونا ہیں اور دَارِ السَّلَامِ سے مراد دَارُ السَّلَامَةِ ہے (اس لیے کہ وہاں کا قول بھی سَلَامًا سَلَامًا ہے) ﴿لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [الأنعام: 127:6] ''ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے۔'' اور اَلسَّلَامُ اللہ تعالیٰ کا بھی اسم ہے ﴿السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ﴾ [الحشر: 23:59] ''سلامتی والا امن دینے والا نگہبان۔'' کیونکہ وہ ہر قسم کے عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔(غ)

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؕ وَ لَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

جو نیکی کرتے ہیں ان کے لیے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر اور ان کے منہ کو نہ سیاہی ڈھانکے گی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ (1390)

---

دنیا کی نعمتوں کے مقابل جن میں دکھ اور تکلیفیں ملی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ ایسے گھر کی طرف بلاتا ہے جو دکھوں اور تکالیف سے پاک ہے۔ انسان اگر سکھ کو چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی سکھ کی طرف بلاتا ہے۔ مگر انسان عارضی سکھ کو مدنظر رکھ کر خود اپنے لیے دکھ کا سامان کر لیتا ہے۔

1390- ﴿الْحُسْنٰى﴾۔ حُسْنٌ [دیکھو نمبر: 106] اور حُسْنٰی میں فرق یہ ہے کہ حسن کا استعمال عام ہے اور حُسْنٰی کا حرف احداث پر۔ (غ) حُسْنٌ اور حُسْنٰی دونوں مصدر ہیں اور گو حُسْنٰی کے معنی زیادہ تر جنت یا [اَلْمَنْزِلَةُ الْحُسْنٰى] لیے گئے ہیں۔ مگر لسان العرب میں ہے کہ اس سے اصل مراد [اَلْمُجَازَاةُ الْحُسْنٰى] ہے اچھا بدلہ اور ابن جریر میں بھی اس کے مطابق اقوال موجود ہیں۔

﴿زِيَادَةٌ﴾۔ تو اصل میں ایک چیز پر کچھ بڑھانے کا نام ہے۔ مگر یہاں چونکہ نعمائے جنت میں اس کا ذکر ہے اس لیے مراد نظر الی وجہ اللہ لی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا دیکھنا جو بہشت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رویت کو زیادہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جس کا تصور بھی دنیا میں ممکن نہیں۔ ابن جریر میں کچھ اور اقوال بھی منقول ہیں۔ مثلاً بڑھا ہوا اجر یا دس گنا اجر۔ یا اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رضوان۔ یا اس دنیا کی نعمتیں۔

﴿يَرْهَقُ﴾۔ رَهِقٌ کے معنی کسی امر نے غالب آ کر اس کو ڈھانک لیا ہیں ﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ [المدثر: 17:74] ''میں اسے سخت مشقت میں مبتلا کروں گا۔'' (غ)

﴿قَتَرٌ﴾۔ قَتَرَةٌ اس غبار کو کہتے ہیں جس پر سیاہی غالب ہو جیسے دھواں۔ (ل) نیز [دیکھو نمبر: 305]

احسان یعنی اپنے نفس میں نیکی کرنے یا دوسرے سے نیکی کرنے کا انجام یہ ہے کہ بدلہ نیک ملتا ہے کچھ اور بھی ملتا ہے اور **چہرہ پر سیاہی چھا جانا جو ناکامی اور نامرادی کا لازمی نتیجہ** ہے وہ پیدا نہیں ہوتی نہ انسان کو ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ ابن جریر نے ان الفاظ کی یوں تفسیر کی ہے: [لَا يَغْشٰى وُجُوْهَهُمْ كَآبَةٌ، وَّلَا كَسُوْفٌ، حَتّٰى تَصِيْرُ مِنَ الْحُزْنِ كَأَنَّمَا عَلَاهَا قَتَرٌ.] یعنی ان کے مونہوں کو رنج و ملال اور تاریکی نہیں ڈھانکے گی یہاں تک کہ غم کے مارے وہ ایسے ہو جائیں گے گویا ان پر دھواں چھا گیا ہے۔ اس کے مقابل پر بدی کے انجام بد کا اگلی آیت میں ذکر کیا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور جو بدیاں کماتے ہیں (تو) بدی کا بدلہ اسی کی مثل ہے اور ان پر ذلت چھا جائے گی کوئی انہیں اللہ سے بچانے والا نہ ہو گا گویا کہ اُن کے مونہوں پر رات کا سیاہ ٹکڑا اُوڑھا دیا گیا ہے۔ یہی آگ والے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر انہیں جنہوں نے شرک کیا تھا کہیں گے تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ ٹھہرے رہو پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے۔ (1391)

---

1391 - ﴿مَكَانَكُمْ﴾۔ فعل محذوف ہے [اِلْزَمُوْا مَكَانَكُمْ] یعنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو۔

﴿زَيَّلْنَا﴾۔ زَالَ کے معنی ایک چیز اپنے طریق سے ہٹتی ہوئی علیحدہ ہوگئی اس سے زوال وغیرہ ہیں۔ اور ﴿تَزَيَّلُوْا﴾ [الفتح: 25:48] کے معنی ﴿تَفَرَّقُوْا﴾ الگ الگ ہوگئے۔ باب تفعیل یہاں تکثیر کے لیے ہے۔ (غ) پس زَيَّلْنَا کے معنی ہیں فَرَّقْنَا۔

## تین قسم کے معبود:

﴿شُرَكَآؤُكُمْ﴾ اور ﴿شُرَكَآؤُهُمْ﴾ سے مراد وہ ہیں جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے تھے۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں: ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ﴾ [المآئدۃ: 117:5] ''میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے۔'' اور ملائکہ کے متعلق ہے ﴿اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ﴾ [السبأ: 40:34] یہاں فرمایا کہ وہ ان کے شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان دونوں یعنی عابد اور معبود کو الگ الگ کردے گا اور دوسری جگہ ہے: ﴿اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ [الأنبیآء: 98:21] ''تم اور وہ چیزیں جن کی تم اللہ کے سوائے عبادت کرتے ہو دوزخ کا ایندھن ہیں۔'' ﴿لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا﴾ [الأنبیآء: 99:21] ''اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے۔'' تو معلوم ہوا کہ ان دونوں مقامات پر الگ الگ قسم کے معبودین کا ذکر

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ بس ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع 3 10 8 النصف

وہاں ہر شخص اس کی خبر پالے گا جو آگے بھیجا تھا اور وہ اللہ اپنے سچے مولیٰ کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو وہ افترا کرتے تھے ان سے جاتا رہے گا۔(1392)

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ

کہہ کون تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے، یا کس کے اختیار میں کان اور آنکھیں ہیں اور کون زندہ مردے سے نکالتا ہے اور مردہ زندہ سے نکالتا ہے اور کون کاروبار (عالم) کی تدبیر کرتا ہے۔

---

ہے ایک تو اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں یا ملائکہ کو معبود بنالیا گیا ہے۔ یہ آیات ان کے متعلق ہیں اور جہاں معبودین کے دوزخ میں پڑنے کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں جو خود اپنے آپ کو بڑا بنا کر دوسروں سے اپنے آپ کو خدا کی طرح منواتے ہیں اور پتھروں اور درختوں اور ہواؤں وغیرہ کو معبود بنا لیتے ہیں تو ان کا ذکر ان دونوں میں نہیں۔ کیونکہ حشر صرف انسانوں کا ہوگا نہ جمادات اور نباتات کا۔

1392 - الْحَقِّ۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے۔[دیکھو نمبر: 65]۔ تَبْلُوْا بَلٰی سے خبر پالینے کے معنی میں ہے۔[دیکھو نمبر: 155]۔

جب اعمال کی سزا کے بھگتنے کا وقت آتا ہے تو غلط سہارے سب گر جاتے ہیں اصل حقیقت انسان کے سامنے منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ ہر انسان یہاں بھی کر سکتا ہے۔ ہر ایک غلط کار کو اپنی غلطیوں کی سزا آخر خود بھگتنی پڑتی ہے اور جو اس کو ان غلطیوں میں ڈالتے ہیں نتیجہ بھگتنے کے وقت وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ رکوع کے پہلے حصہ میں بتایا تھا کہ مصیبتوں کے وقت فطرت انسانی صرف اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتی ہے اور معبودان باطل کو اس وقت انسان بھول جاتا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کے مقابلہ میں آخری آیات میں اس مصیبت عظمیٰ کی طرف توجہ دلائی ہے جو بدکرداروں کے لیے نتائج اعمال کے رنگ میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس وقت انکشاف کامل ہوگا کہ غیر اللہ معبود کسی کام نہیں آسکتے بلکہ وہ معبود بھی انکار کریں گے کہ ان کی عبادت کی جاتی تھی۔

فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

تو کہیں گے اللہ۔ پس کہہ پھر کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔(1393)

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

تو یہی اللہ تمہارا سچا رب ہے اور حق کے بعد کیا ہے مگر گمراہی۔ پھر تم کہاں سے پھرے جاتے ہو۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

اسی طرح تیرے رب کی بات ان پر صادق آئی جنہوں نے نافرمانی کی کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔(1394)

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا

کہہ کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پہلے پیدا کرتا

---

1393 - ﴿يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾ سے مراد ہے کہ کون ان قوتوں کو وجود میں لانے والا اور کون ان کی حفاظت کا متولی ہے۔(غ)

**مشرکین کا اقرارِ توحید:**

پچھلے رکوع میں یہ بتایا تھا کہ مصیبت کے وقت فطرت انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے اور معبودان باطل کو بھول جاتی ہے اسی سے اس ہولناک وقت کی طرف توجہ دلائی تھی جو نتائج اعمال کے بھگتنے کا وقت ہوگا کہ خود وہ معبود بھی انکار کریں گے۔ اسی مضمون کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ایک بت پرست فطرت بھی اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کی شہادت دے اٹھتی ہے۔ اور بعض باتوں میں تو مجبوراً اسے بھی ماننا پڑتا ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ چنانچہ آسمان اور زمین سے رزق کا دینا۔ آسمانی رزق سے مراد یا تو وحی کا نزول ہے اور زمینی رزق سے مراد جسمانی سامانوں کا عطا کرنا اور یا آسمان کا رزق پانی ہے جو اوپر سے برستا ہے اور زمین کا رزق اس پانی سے روئیدگی کا نکلنا ہے۔ ایسا ہی سمع اور بصر پر اختیار یعنی قوائے انسانی پر کیونکہ سمع اور بصر دو اعلیٰ ترین قوائے انسانی ہیں۔ پھر مردوں سے زندوں کو اور زندوں سے مردوں کو نکالنا جسمانی رنگ میں ہو یا قوموں کی احیا و اماتت ہو اور خلاصہ ان سب امور کا تدبیر امر میں آجاتا ہے۔ جس سے مراد نظام عالم کا چلانا ہے۔ مسیح کی پرستش کرنے والا یا شجر یا حجر کی پرستش کرنے والا مانتا ہے کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے ہی ہیں۔ اس لیے فرمایا پھر مستحق پرستش دوسرے کس طرح ہو گئے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں واضح کر دیا۔

1394 - فَسَقَ۔ یہاں عام معنی میں ہے یعنی عہد فطرت کی خلاف ورزی مراد ہے۔ کیونکہ اوپر عہد فطرت کی طرف اشارہ ہے جو اس عہد کی نافرمانی کرتے ہیں وہ اس دوسرے عہد یعنی شریعت یا وحی کو بھی قبول نہیں کرتے۔

الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

ہے پھر اسے دہراتا ہے۔ کہہ اللہ ہی پہلے پیدا کرتا ہے پھر اسے دہراتا ہے، پھر تم کہاں سے الٹ جاتے ہو۔ (1395)

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

کہہ کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو صحیح راہ بتاتا ہے، کہہ اللہ ہی صحیح راہ بتاتا ہے۔ تو کیا وہ جو صحیح راہ بتاتا ہے زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا۔ سوائے اس کے کہ اسے راہ دکھائی جائے۔ تمہیں کیا ہو گیا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔ (1396)

---

1395 - **بدء الخلق اور عود:** خلق کے لوٹانے سے مراد بعد موت زندگی بھی ہو سکتی ہے۔ تو گو وہ اس کے قائل نہ تھے مگر مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جب وہ پہلی بار بھی خلق نہیں کر سکتے تو دوسری زندگی جو اللہ تعالیٰ کے اور بھی عجائبات قدرت سے ہے اور ایک حقیقت ہے اس پر وہ کیونکر قادر ہو سکتے ہیں اور یا پہلی خلق سے مراد بارِ اول اشیاء کو وجود میں لانا اور اعادہ سے مراد ایک قانون کے ماتحت ان کو بار بار پیدا کرتے رہنا ہے جیسے انسان اول کو پیدا کیا یہ بدء ہے۔ پھر اس سے آگے ایک قانون کے ماتحت نسل چلائی یہ اعادہ ہے۔ اس صورت میں معنی ظاہر ہیں۔

1396 - ﴿يَّهْدِيْۤ﴾۔ اصل میں يَهْتَدِيْ ہے اور اِهْتَدَآء کے معنی ''ہدایت پانا ہیں۔'' اور هَدٰى لے جانا بھی ہیں جیسے: [هَدَيْتُهٗۤ إِلَى الطَّرِيْقِ يا لِلطَّرِيْق] یا [هَدَيْتُ الْعُرُوْسَ اِلٰى زَوْجِهَا] اور یہاں هَدٰى اور اِهْتَدَى کے معنی محض انتقال مکان کے کیے گئے ہیں: [لَا يَقْدِرُ أَن يَّنْتَقِلَ عَنْ مَّكَانِهٖ إِلَّا أَنْ يَّنْقُلُوْهُ] (ل) یعنی ''اس بات پر قادر نہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ خود جا سکے سوائے اس کے کہ دوسرے اسے لے جائیں۔'' اور قرآن شریف میں ہے: ﴿اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى﴾ [طٰہٰ: 10:20] ''یا (اسی) آگ پر رستہ پاؤں۔'' جہاں هدی سے مراد صرف رستہ ہے۔ (ل) اور دوسری جگہ ہے ﴿فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ﴾ [الصافات: 23:37] ''پھر انہیں دوزخ کے رستہ کی طرف لے جاؤ۔'' اور ایک ہدایت ﴿اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ [طٰہٰ: 50:20] ''ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر اسے (اپنے کمال کی) راہ دکھائی۔'' والی ہے جس سے مراد اپنے دائرہ استعداد میں ترقی ہے۔ [دیکھو نمبر: 5]

**معبودان غیر اللہ کا عجز:**

تیسری بات جس کی طرف توجہ دلائی (پہلی تدبیر امر ہے [آیت نمبر: 31]۔ دوسری خلق [آیت نمبر: 34]) وہ ہدایت کا دینا ہے یہ بھی کوئی بت یا کوئی معبود باطل نہیں دیتا صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اور معبودان باطل کے متعلق جو فرمایا کہ ﴿لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ

وَ مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور ان میں اکثر اٹکل پر ہی چلتے ہیں، حق کے مقابلے میں اٹکل کچھ کام نہیں دیتی اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (1397)

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اوروں کا افترا ہو، بلکہ یہ اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور کتاب کی تفصیل ہے جس میں کچھ شک نہیں، جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔ (1398)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

کیا کہتے ہیں کہ اسے از خود جھوٹ بنالیا ہے۔ کہہ ایک سورت اس جیسی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلاسکو بلالو اگر تم سچے ہو۔

---

يُّهْدٰى﴾ تو یا ﴿عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ [الأعراف: 194:7] ''تمہاری طرح بندے ہیں۔'' مراد ہیں کہ وہ خود محتاج ہدایت ہیں اور یا ھدی سے مراد ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہے یعنی وہ خود چلنے کے قابل بھی نہیں اور یا وہ ہدایت عامہ مراد ہے جو جاندار اور بے جان اور ذی عقل اور غیر ذی عقل سب کو دی جاتی ہے کہ اس کا دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔

1397 - غیر اللہ کی پرستش اس لحاظ سے ظنی ہے کہ ان کے پرستار کو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے کوئی نفع پہنچے یا کسی نقصان سے بچ جائے۔ اس کے مقابل حق یعنی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ معلوم ہوا کہ **قرآن شریف ظنی باتوں کے اتباع سے روکتا ہے** اور ان باتوں کی طرف بلاتا ہے جو ثابت شدہ حقائق ہیں۔

1398 - یہاں دو باتیں بالخصوص بتائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ **قرآن افترا نہیں**۔ ایک پہلی کتابوں کا مصدق ہونا یعنی ان پیشگوئیوں کا پورا کرنے والا ہے جو اس کے آنے سے ہزارہا برس پہلے موجود ہیں۔ ان پیشگوئیوں کو محمد رسول اللہ ﷺ نے نہیں بنایا۔ اور دوسرا یہ تفصیل کتاب ہے یعنی وہ باتیں جو پہلی کتابوں میں مجمل اور مبہم رہ گئی ہیں، ان کی تفصیل یہ قرآن شریف فرماتا ہے۔ جیسے مسئلہ معاد یا مسئلہ صفات الٰہی کہ پہلی کتابیں اس بارہ میں بہت ہی اجمالی تعلیم دیتی ہیں۔ ایسا ہی ان کتابوں میں دلائل کا نام ونشان نہیں۔ اگلی آیت میں اس دعوے کو اور مضبوط کیا کہ اگر تم پھر بھی اسے افترا سمجھتے ہو تو اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ۔ اس کے لیے [دیکھو نمبر:37]۔ اور قرآن کا ذکر یہاں اس لحاظ سے کیا کہ اس میں دلائل توحید الٰہی ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

بلکہ اسے جھٹلاتے ہیں جس کے علم کا وہ احاطہ نہیں کر سکتے اور ابھی اس کی حقیقت ان تک نہیں آئی اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔ تو دیکھ لو ظالموں کا انجام کیسا ہوا؟(1399)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع 4 10 9

اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور تیرا رب فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ

اور اگر تجھے جھٹلائیں تو کہہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم اس سے بری ہو جو میں کرتا

---

1399 - ﴿يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ﴾ کسی چیز کا احاطہ از روئے علم کامل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔[دیکھو نمبر: 329]۔لیکن انسان بھی اس میں سے جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے حاصل کرتے رہتے ہیں۔﴿وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾[البقرة: 255:2] ''اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے۔'' یہاں ان کے احاطہ بالعلم نہ کرنے سے مراد ان کا تدبر نہ کرنا ہے۔ کیونکہ انسان کو جو علم ملتا ہے تدبر سے ملتا ہے۔

تَاْوِيْل کے معنی کے لیے[دیکھو نمبر: 376]۔اصل حقیقت یا انجام دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یہاں انجام مراد ہے۔

**علوم قرآنی اور تکذیب کرنے والوں کا غور نہ کرنا:**

مثل لانے کی تحدی کے بعد اس کتاب کے علوم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جھوٹ تو کہہ دیا مگر اس کے علوم کی خبر تک نہیں۔ اس کے مضامین عالیہ پر کبھی غور نہیں کیا۔ اگر غور کرتے تو خود وہ باتیں ہی ان کے دلوں کو کھینچ لیتیں۔ تو یہ کس قدر جرأت ہے کہ بغیر ایک چیز کا علم حاصل کرنے کے اس کی تکذیب شروع کر دی۔ چونکہ حقیقت معنی کا ذکر احاطہ بالعلم میں آ چکا ہے اس لیے تاویل سے مراد تاویل فعلی یا انجام ہے۔ اور اسی انجام تکذیب کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں توجہ دلائی ﴿كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ﴾ پس مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علوم پر غور کرتے تو اس کی تکذیب نہ کرتے اور جو تکذیب کی ہے تو اب اس کا انجام وہی ہوگا جو ان کو پہلے سے بتا دیا گیا ہے۔

اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔ (1400)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تو بہروں کو سنائے گا گو وہ عقل سے کام نہ لیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف نظر اٹھاتے ہیں تو کیا تو اندھوں کو راہ دکھائے گا گو وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ (1401)

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۴۵﴾

اور جس دن ان کو اکٹھا کرے گا گویا نہ رہے تھے مگر دن کی ایک گھڑی، ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت پانے والے نہ ہوئے۔ (1402)

---

1400 - پچھلے رکوع کے آخر پر توحید کے ذکر میں قرآن کریم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تکذیب میں انہوں نے جلدی کی ہے اس کا انجام آ کر رہے گا۔ اس رکوع میں اسی عذاب کا ذکر ہے جو تکذیب پر آتا ہے اور پہلے بطور تمہید بیان فرمایا کہ ہر ایک کی ذمہ داری اپنے اپنے اعمال کی ہے۔ اس لیے جو حق کی مخالفت کرتا ہے اور اس کا استیصال چاہتا ہے وہ لازماً سزا پاتا ہے۔

1401 - جب اعمال کی ذمہ داری کا ذکر کیا تو بتایا کہ بعض لوگ بظاہر کان تو لگاتے ہیں یعنی آواز تو ان کے کان میں پڑتی ہے مگر عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس لیے سن کر فائدہ نہیں اٹھاتے اور آنکھوں سے دیکھتے تو معلوم ہوتے ہیں مگر چونکہ **بصیرت سے کام نہیں لیتے** اس لیے ان کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔ اور یہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سزا بطور ظلم نہیں دیتا۔

1402 - **آرام اور مصیبت کا مقابلہ:** دنیا میں جو مدت رہے ہیں وہ ایک گھڑی بھر سے بھی کم معلوم ہوگی۔ انسان کتنی بھی عمر آسائش اور آرام میں گزارے جب مصیبت آتی ہے تو وہ سب ایک گھڑی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے سے بھی یہی مطلب ہے کہ گویا علیحدہ ہوئے کوئی عرصہ نہیں گزرا۔

وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور اگر ہم ان وعدوں میں سے جو انہیں دیتے ہیں کچھ تجھے دکھادیں یا تجھے وفات دیں تو ہماری طرف ہی انہیں لوٹ کر آنا ہے پھر اللہ اس پر گواہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (1403)

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور ہر ایک قوم کے لیے ایک رسول ہے سو جب ان کا رسول آ جاتا ہے ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ (1404)

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا

کہہ میں اپنے لیے نہ برے کا مالک ہوں نہ بھلے کا، سوائے

---

1403 - **آنحضرت ﷺ کے مخالفین پر قیامت تک سزا کا آتے رہنا:** مطلب یہ ہے کہ سزا کے سارے وعدوں کا آپ کی زندگی میں پورا ہونا ضروری نہیں اور حق تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کا دامن جب قیامت تک ممتد ہے اور قرآن کریم میں سب ہی مکذبین اور مخالفین کا ذکر ہے تو ان کی سزائیں سب کی سب آنحضرت ﷺ کی زندگی میں کس طرح وارد ہوسکتی تھیں۔ اور بعض کا آپ کو دکھایا جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اللہ اس پر گواہ ہے جو وہ کرتے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جس جس کو وہ جس سزا کے لائق سمجھے گا دیتا رہے گا۔

1404 - ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ یہ وہ عظیم الشان صداقت ہے جو اسلام سے پہلے کسی نے نہیں سکھائی۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت چونکہ کل دنیا کی طرف ہوئی اس لیے سب عالم ایک ہی امت کے حکم میں ہوگیا۔ رسول کا اب کسی قوم کے پاس آنا، ان کو تبلیغ ہونا ہے۔ جس قوم پر آپ کی تعلیم کی تبلیغ ہوگئی اسی کے متعلق اس آیت کا مضمون صادق آ گیا اور بَيْنَهُمْ سے مراد رسول اور اس کے مخالف ہیں کہ ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا ہے یعنی مخالفین پر سزا وارد ہوتی ہے۔ اسی کے متعلق اگلی آیت میں سوال ہے کہ وہ سزا کب آئے گی۔ اور قرآن کریم میں ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ [یونس: 48:10] ''یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا''، ﴿مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ﴾ [السجدة: 28:32] ''یہ فیصلہ کب ہوگا'' اکثری دنیوی عذاب کے متعلق ہی ہے۔

مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

اس کے جو اللہ چاہے۔ ہر ایک قوم کا ایک وقت ہے جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔ (1405)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّا ذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

کہہ بتاؤ اگر اس کا عذاب رات یا دن کو تم پر آ جائے تو اس میں سے وہ کیا ہے جس کے لیے مجرم جلدی کر رہے ہیں۔ (1406)

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

(اور) کیا پھر جب وہ آ ہی جائے گا اس پر ایمان لاؤ گے، اب (ایمان لاتے ہو) اور (پہلے) اس کے لیے جلدی مچاتے تھے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ

پھر انہیں جنہوں نے ظلم کیا تھا کہا جائے گا دیر پا عذاب

---

1405 - جب یہ سوال ہوا کہ وہ سزا ہم پر کب آئے گی تو فرمایا کہ جواب میں کہہ دو کہ تمہیں سزا پہنچانے کا اختیار مجھے کہاں ہے۔ میں تو اپنی جان کے لیے بھی کسی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس قسم کے الفاظ جو قرآن کریم میں بار بار آئے ہیں نہ صرف آپ کے پیروؤں کو غلو سے روکتے ہیں بلکہ دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ **حق کے قبول کرنے میں کسی نفع نقصان کا لالچ نہ دیں** بلکہ حق کی خاطر حق کو قبول کرنے کے لیے بلائیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہر قوم کے لیے ایک میعاد مقرر ہے۔ تو اس میں یہ تعلیم دی ہے کہ جس طرح انسان پیدا ہوتے اور مرتے ہیں اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی اور مرتی ہیں اور ہر ایک قوم کے لیے علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب وہ صف لپیٹ لی جاتی ہے۔ پس کسی قوم کو اپنی طاقت پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ جس طرح کسی انسان کو اپنی قوت پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔

1406 - **تعیش اور غفلت سے عذاب آتا ہے:** رات کے وقت غافل لوگ عیش و عشرت میں مصروف ہوتے ہیں اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔ دن کے وقت اپنے کاروبار کی مصروفیت میں خدا سے دور پڑ جاتے ہیں۔ یہی اشارہ دن اور رات کے وقت عذاب کے آنے میں ہے۔ فرمایا جب عذاب خود ہی آنے والا ہے تو پھر جلدی مانگنے سے کیا حاصل۔

الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

چکھو تمہیں بدلہ نہیں دیا جاتا مگر وہی جو تم کماتے تھے۔

وَ يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ ع 5 13 10

اور تجھ سے دریافت کرتے ہیں کیا یہ سچ ہے۔ کہہ ہاں! میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔ (1407)

وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور اگر ہر شخص کے لیے جس نے ظلم کیا وہ (سب کچھ) ہو جو زمین میں ہے تو اس کے ساتھ فدیہ دینا چاہے گا اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے اور ان میں انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ (1408)

---

1407 - ﴿اِیْ﴾۔ حرف جواب اور تصدیق ہے جس کے معنی نَعَمْ ہیں یعنی ہاں اور اس کا استعمال اس طرح پر قسم کے ساتھ خاص ہے۔ پھر اسی عذاب کے متعلق سوال ہے کہ کیا ایسا سچ مچ ہوگا۔ جب ایک قوم طاقت کے نشہ میں ہوتی ہے تو اسے کبھی خیال نہیں آتا کہ اس کے لیے بھی کوئی وقت آنے والا ہے جب اس کی طاقت نابود کر دی جائے گی۔ یہ بار بار کے سوال اسی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

1408 - ﴿اَسَرُّوا﴾۔ سِرّ اور اَسْرَارٌ خلاف اعلان ہے: ﴿سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً﴾ [البقرة: 274:2] ''چھپ کر اور ظاہر۔'' اور سِرّ وہ بات ہے جو دل کے اندر چھپائی ہوئی ہو اور اَسَرُّوا کے معنی انہوں نے چھپایا۔ مگر بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں ظاہر کیا۔ کیونکہ دوسری جگہ ان کا قول منقول ہے: ﴿يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا﴾ [الأنعام: 27:6] ''اے کاش! ہم لوٹائے جائیں اور رب کی باتوں کو نہ جھٹلائیں۔'' مگر وہ ندامت صرف اسی قدر نہیں جس کا یہاں اشارۃً ذکر ہے۔ ہاں اسرار جب دوسرے کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے اس پر ظاہر کرنا اور اس کے غیر سے چھپانا ﴿وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا﴾ [التحريم: 3:66] ''اور جب نبی نے اپنی ایک بیوی سے ایک بھید کی بات کہی۔'' ﴿وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا﴾ [نوح: 9:71] ''اور چھپ کر بھی ان سے کہا۔'' گویا ایک رنگ میں اظہار اور ایک رنگ میں اخفا۔ (غ) اور بعض اہل لغت نے اِسْرَارٌ کو اضداد میں سے قرار دیا ہے یعنی اس کے معنی ظاہر کرنا بھی ہیں اور چھپانا بھی۔ (ت)

ندامت کو چھپانے سے مراد یہ ہے کہ بڑے لوگ اپنے متبعین سے ندامت کو چھپائیں گے۔ تکذیب پر جس عذاب کا وعدہ تھا اسی

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

سنو اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سنو اللہ کا وعدہ سچا ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے اور اس کے لیے شفا جو سینوں میں ہے اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت۔ (1409)

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

کہہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر ہاں اسی پر چاہیے کہ خوش ہوں، وہ اس (دولت) سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (1410)

---

کا یہاں ذکر ہے۔ وہ دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے گو کامل طور پر قیامت میں ظہور پذیر ہوگا۔

1409 - صُدُوْرِ۔ صَدْرٌ سینہ کو کہتے ہیں۔ اور راغب نے بعض حکماء کا قول نقل کیا ہے کہ جہاں قلب کا ذکر ہے تو اشارہ عقل اور علم کی طرف ہے جیسے: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾ [قٓ: 37:50] ''اس میں ان کے لیے نصیحت ہے جس کا دل ہے۔'' اور جہاں صدر کا ذکر ہے تو اس کی طرف اور تمام قویٰ مثلاً شہوت، ہوا، غضب وغیرہ کی طرف ہے۔ (غ) پس ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ سے مراد ہوئی کہ سب قویٰ کی اصلاح ہے۔

تکذیب کے انجام بد سے ڈرا کر اور پچھلی آیات میں یہ بتا کر کہ واقعی طاقت اور قدرت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جو برسر طاقت ہیں وہ خوب یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اب اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم تکذیب میں کیوں جلدی کرتے ہو۔ **قرآن تو تمہارے رب کی طرف سے ایک وعظ ہے** اور وعظ کو روکنا ہے اس طرح کہ بدی کے بد انجام سے ڈرایا ہے۔ دوسری بات فرمائی کہ انسان کو جو کچھ قویٰ دیئے گئے ہیں ان کے لیے یہ دوا ہے یعنی ان کی اصلاح کرتا ہے۔ تیسری بات ہدایت ہے کہ ان کو صحیح راہ پر لگاتا ہے اور چوتھی رحمت کہ اس سے اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی اخلاق فاضلہ کی بلند ترین منازل پر پہنچاتا ہے جو دنیا کے لیے موجب رحمت ہے۔

1410 - **اخلاق اور مال:** یہاں اسی بات کو واضح کر کے بیان کیا ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ فضل اور رحمت ہے جو تم کو بلند مقامات پر

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

کہہ کیا دیکھتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے رزق اتارا ہے، پھر تم اس سے حرام اور حلال ٹھہراتے ہو۔ کہہ کیا اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے؟ یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو۔ (1411)

وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع 6 7 11

اور جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں قیامت کے دن کی نسبت ان کا کیا خیال ہے؟ یقیناً اللہ لوگوں پر فضل کرتا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ

اور تو کسی حال میں نہیں ہوتا اور نہ اس میں کچھ قرآن پڑھتا ہے اور نہ تم کچھ کام کرتے ہو مگر ہم تم پر موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے

---

پہنچاتا ہے اور اس مال و دولت سے جس کے جمع کرنے کی فکر میں تم اس کی تکذیب کرتے ہو وہ بہت بہتر ہے۔ گویا سمجھایا ہے کہ اخلاق فاضلہ دولت سے اچھی چیز ہے۔ قرآن کریم تم میں وہ اخلاق فاضلہ پیدا کرتا ہے۔ تم دولت کے جمع کرنے کے لیے بڑی کوشش کرتے ہو، لیکن ان اخلاق کے لینے کے لیے کیوں متوجہ نہیں ہوتے۔ دولت سے انسان عزت اور راحت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر دولت سے یہ چیزیں کبھی نہیں ملتیں اور جو عزت اور راحت ہمیشہ کے لیے اخلاق فاضلہ سے ملتی ہے وہ دولت سے عارضی طور پر بھی نہیں مل سکتی۔

1411 - رِزْقٍ عطائے جاری کو کہتے ہیں دنیوی ہو یا اخروی۔ اور مال اور جاہ اور علم سب رزق میں داخل ہیں۔ (غ)

ایک معنی تو ظاہر ہیں کہ مشرک بعض قسم کی چیزوں کو حرام قرار دے لیتے تھے: ﴿هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ﴾ [الأنعام: 138:6] ''یہ چار پائے اور کھیتی منع ہے۔'' مگر سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اخلاق سے بھی رزق دیا ہے اور قیام جسم کے لیے بھی۔ پھر تم اس رزق سے جو اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اپنے آپ کو بکلی محروم رکھ کر اسے گویا حرام ٹھہرا رہے ہو۔ ﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اگلی آیت بھی اسی معنی کی مؤید ہے کیونکہ فرمایا کہ یہاں تو اس رزق سے تم دن کاٹ لو گے مگر قیامت کے دن کی نسبت جہاں یہ رزق ساتھ نہیں ہوگا تمہارا کیا خیال ہے یعنی اس کے لیے کیوں کچھ بھی تیاری نہیں کرتے۔

وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾

ذرّہ کے وزن کے برابر بھی کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے۔ (1412)

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

سنو اللہ کے دوستوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (1413)

---

1412 - ﴿شَاْنٍ﴾۔ حال اور معاملہ کو کہتے ہیں جو واقع ہو اور جو سنوارنے والا ہو۔ اور یہ لفظ صرف بڑے اہم احوال اور امور پر بولا جاتا ہے۔ (غ)

﴿تُفِيْضُوْنَ﴾۔ [اَفَاضَ فِي الْحَدِيْثِ] کے معنی ہیں بات کو پھیلایا یا اس میں کثرت سے لگ گئے۔ (ل) [دیکھو نمبر: 1335] اور یہ خوض کے ہم معنی بھی ہے۔ (غ) جس کا اکثر استعمال مذمت کے مقام پر ہے۔

يَعْزُبُ۔ عَازِبٌ وہ شخص ہے جو چارہ کی تلاش میں اپنے اہل سے دور نکل جائے۔ (غ) اس لیے عزب بمعنی غَابَ یا بُعْدَ ہے۔ یعنی غائب ہوا یا دور ہوا۔

كِتٰبٍ۔ كِتَابٌ سے مراد ہمیشہ لکھے ہوئے اوراق نہیں ہوتے بلکہ بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے وہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اندازہ کیا ہے اور بعض وقت مراد اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کا ایجاب اور اس کا حکم ہوتا ہے۔ (غ) اور یہاں ﴿كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ سے مراد علم الٰہی ہے اور مبین اس کو اس لحاظ سے کہا کہ نتائج اعمال ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

جب کفار کو یہ توجہ دلائی کہ وہ بجائے تکذیب کے قرآن کریم سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ اس میں شفا اور ہدایت ہے۔ تو اب یہ بتایا کہ یہ قرآن اپنی پیروی کرنے والوں کو کن مقامات عالیہ پر پہنچاتا ہے۔ اور اس پہلی آیت میں تلاوت قرآن کریم کا ذکر کیا خواہ خطاب خاص نبی ﷺ سے لیا جائے یا عام۔ اور آپ کے یا آپ کے سچے متبعین کی ساری شانیں ہی اچھی ہیں۔ مگر تلاوت قرآن کا بالخصوص ذکر کیا۔ مِنْهُ میں ضمیر اسی شان کی طرف ہے اور یا اللہ کی طرف یعنی اللہ کی طرف سے نازل شدہ قرآن کی تلاوت کرتے ہو یا قبل الذکر ضمیر قرآن کی طرف ہے اور خطاب واحد کے بعد خطاب کو جمع کر کے بتا دیا کہ اصل خطاب سب سے ہی ہے اور ﴿لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ﴾ میں سب مومن مراد ہیں جو کسی کام میں لگے ہوں۔ تو ان کو خوش خبری دی ہے کہ تمہارا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے۔ اور اَفَاضَةٌ کے اصل معنی چونکہ کثرت یا زور سے کسی بات یا کام میں لگنا ہیں اس لیے یہ معنی بھی درست ہیں اور بعض نے ﴿اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ﴾ میں مراد مخالفین کو لیا ہے کہ قرآن کے بارے میں جھوٹ کو شائع کرتے ہو مگر پہلے معنی ہی قابل ترجیح ہیں۔ (ج) اور اگلی آیت میں صفائی سے اولیاء اللہ کا ذکر کر کے بتا بھی دیا کہ یہاں مراد وہی لوگ ہیں جو نبی ﷺ کے اتباع میں اعمال صالح میں لگے رہتے ہیں۔

1413 - ﴿اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ﴾ وَلِيّ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 332]۔ ﴿اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ﴾ کہنے سے یہ منشا ہے کہ وہ اللہ کے دین کی نصرت کرتے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے تھے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوشخبری ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔ (1414)

---

ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کا ناصر ہوتا ہے۔

## قرآن کس مقام بلند پر پہنچاتا ہے:

تکذیب کرنے والوں کے مقابلہ پر یہاں انصار اللہ کا ذکر کیا جن کو یہاں ﴿اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ﴾ کے نام سے پکارا ہے اور اگلی آیت میں بتادیا کہ وہ کون لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ پس اس کے بعد جو نصرت دین کرتے ہیں وہی اولیاء اللہ ہیں۔ ان کا اس مقام بلند پر پہنچ جانا یقینی بیان کیا ہے جو نجات کامل کا مفہوم ہے کہ نہ ان پر خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے اور یہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر انسان اس دنیا میں پہنچ سکتا ہے اور حقیقی راحت انسان کو اسی وقت میسر آتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جس پر پہنچ کر انسان یہیں جنت کو پالیتا ہے۔

1414 - ﴿الْبُشْرٰى﴾۔ بَشَارَةٌ اور بُشْرٰی اس خبر کو کہا جاتا ہے جو خوش کرنے والی ہو۔ ﴿وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى﴾ [العنکبوت: 31:29] ''اور جب ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔'' ﴿يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ﴾ [یوسف: 19:12] ''خوش خبری ہو یہ لڑکا ہے۔'' اور بشیر وہ ہے جو ایسی خبر دیتا ہے ﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ﴾ [یوسف: 96:12] ''پھر جب خوش خبری دینے والا آ پہنچا۔'' اور ہواؤں کو بھی مبشر کہا ہے ﴿يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ﴾ [الروم: 46:30] ''ہواؤں کو خوش خبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [اِنْقَطَعَ الْوَحْيُ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ] (المفردات فی غریب القرآن، جلد1، صفحہ48) اور وہ رؤیائے صالحہ ہیں جو مومن دیکھتا ہے یا جو اس کے لیے دکھائی جاتی ہیں۔ (غ)

﴿اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ﴾ کو اگر ایک طرف یہ خوش خبری دی تھی کہ ان کے لیے خوف وحزن باقی نہ رہے گا تو اب دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بشارتیں ہوں گی اور یہی وہ بلند ترین مقام ہے جس کو قرآن کریم نے فوز عظیم کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حدیث صحیح میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں فرمایا: [لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ] (صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب الْمُبَشِّرَاتِ ، حدیث: 6990) یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان جو سفارت کا کام انبیاء کرتے تھے اس میں سے اب صرف مبشرات باقی رہ گئی ہیں جو مومنوں کو ملتی رہیں گی۔ نبوۃ یا سفارۃ تو کئی ایک چیزوں کے مجموعہ کا نام تھا۔ مثلاً مبشرات کے علاوہ کتاب کا ملنا جیسا کہ ﴿وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ﴾ [البقرۃ:

وَ لَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ اور ان کی بات تجھے غمگین نہ کرے، عزت سب اللہ کے

213:2] ''اور ان کے ساتھ کتاب اتاری۔'' سے ظاہر ہے یا کسی نمونہ کا ظاہر کرنا وغیرہ۔ اس سفارۃ میں ایک حصہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تائیدات اور نصرتوں کی خوش خبری اس کے بندوں کو پہنچائی جائے۔ سو وہ حصہ باقی رہ گیا۔ یعنی کل میں سے ایک جزو اور بلحاظ اس اصل پیغام کے جو اللہ تعالیٰ کی راہوں کا بتانا اس کے اوامر و نواہی کا پہنچانا وغیرہ ہے۔

## مبشرات چالیسواں جزو نبوت میں:

اسے نبوت کا صرف چالیسواں اور چھیالیسواں یا ساٹھواں حصہ قرار دیا ہے۔ اور مبشرات کی تشریح حدیث میں رویائے صالحہ سے کی ہے اور اس میں الہام بھی داخل ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو جو بذریعہ رؤیا یا کشف یا الہام انسان تک پہنچایا جاتا ہے ﴿مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾[الأحزاب: 53:33] ''پردے کے پیچھے سے۔'' میں داخل کیا ہے۔ اور حدیث نے بلحاظ کثرت کے جو رؤیا کو حاصل ہے اسی کو اصل قرار دیا ہے۔ پس یہ آیت بھی جس کی تفسیر یہ حدیث کرتی ہے ختم نبوت پر دلیل ہے۔ کیونکہ اس کی رو سے صرف مبشرات باقی رہ گئی ہیں اور متعدد حدیثوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد رویائے صالحہ ہے۔ دیکھو ابن جریر اور ابن کثیر۔

## انقطاع نبوت سے انقطاع مقامات عالیہ نہیں ہوا:

یہاں آیت کے آخر پر یہ لفظ لاکر ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾[التوبة: 72:9] یہی بڑی بھاری کامیابی ہے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر انسان پہنچ سکتا، اس سے اوپر کوئی مقام نہیں۔ اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اب نبوت نہیں تو کچھ بھی نہیں یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا دروازہ بند ہو گیا۔ حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [إِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ، فَلَا رَسُولَ بَعْدِيْ وَلَا نَبِيَّ"، قَالَ: فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَى النَّاسِ، قَالَ: قَالَ: "وَلٰكِنِ الْمُبَشِّرَاتُ".] (مسند أحمد، جلد21، صفحہ 326) یعنی رسالت اور نبوت منقطع ہو گئی اور میرے بعد کوئی رسول نہیں اور نہ کوئی نبی ہے تو یہ بات لوگوں پر شاق گزری تو آپ نے فرمایا لیکن مبشرات باقی ہیں۔ جس میں یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ کا مکالمہ و مخاطبہ جو اصل نعمت ہے وہ باقی ہے، کیونکہ وہ معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہے: [رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ] (صحيح بخاری، كتاب فضائل الصحابة، باب مَنَاقِبُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَبِي حَفْصٍ الْقُرَشِيِّ الْعَدَوِيِّ رضی الله عنه، حديث: 3689م) میں، ہاں نبوت کی اصل غرض چونکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کا ظاہر کرنا تھا اور تکمیل دین کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی اس لیے اب نبوت نہیں مگر مقامات عالیہ تک پہنچنے کی سب راہیں موجود ہیں بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر۔ چنانچہ احمد اور ابن ابی ماثم اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [عِبَادٌ لَيْسُوا بِأَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّونَ وَالشُّهَدَاءُ ؛ لِمَقْعَدِهِمْ وَقُرْبِهِمْ مِنَ اللهِ] (مسند أحمد، جلد37، صفحہ 530) (ر) یعنی اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو نبی اور شہید نہیں لیکن نبی اور شہیدان کے مرتبہ

جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾

لیے ہے۔ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (1415)

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَ مَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿٦٦﴾

سنو اللہ کے لیے ہی ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور جو اللہ کے سوا (اوروں کو) پکارتے ہیں وہ (ان) شریکوں کی پیروی نہیں کرتے وہ صرف (اپنے) خیال کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ (1416)

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن روشنی دینے والا (بنایا) یقیناً اس

---

اور ان کے اللہ تعالیٰ کے قرب پر رشک کریں گے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت ہے: [إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ عِبَادًا يَغْبِطُهُمُ الأَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ] (مسند أبي يعلى، جلد10، صفحہ495، حدیث: 6110) اور جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں تو آپ نے ان کے متعلق کچھ باتیں بیان کر کے یہ آیت پڑھی: ﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾ [یونس: 62:10] ''سنو! اللہ کے دوستوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' (ج) اور ایسی ہی روایت ابوداؤد میں ہے۔ (ث) اور ان روایات کا ماحصل یہی ہے کہ قرب الٰہی کے مراتب اسی طرح لوگوں کو ملتے رہیں گے اور انقطاع نبوت سے مقامات عالیہ سے محروم نہیں کیے جائیں گے۔

1415 - مومنین کے ان مدارج عالیہ کو کفار کیا سمجھ سکتے تھے جن کی نظریں دنیا تک محدود تھیں اور جنہیں مال اور دولت دنیوی اور حکومت ظاہری پر ناز تھا۔ اس لیے تسلی کے طور پر فرمایا کہ ان باتوں سے غمگین مت ہو۔ عزت و ذلت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مومن اگر اس وقت دنیوی طور پر بے کسی کی حالت میں ہیں تو یہ بھی کوئی غم کی بات نہیں۔ اصل عزت سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ ان کو بھی دے دے گا۔ ﴿سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ میں ان کے اعمال حسنہ کے نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے۔

1416 - پہلی آیت کے مضمون کو اور واضح کیا ہے کہ حکومت اور بادشاہت سب اللہ کی ہے اور کسی کو خدا کا شریک سمجھ کر پکارنا اس خیال سے کہ اس سے کچھ نفع پہنچے گا بے سود ہے۔ اس لیے کہ یہ صرف جھوٹ اور وہم کی پیروی ہے۔ حقیقت میں وہ کوئی شے ہی نہیں جس کی وہ پیروی کرتے ہیں ﴿مَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ﴾ یعنی [أَيَّ شَيْءٍ يَتَّبِعُ] یہ کس چیز کی پیروی کرتے ہیں؟ گویا وہ کچھ بھی نہیں۔ خَرَصَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 1030]۔

لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٧﴾

میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو سنتے ہیں۔ (1417)

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾

کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنایا وہ (اس سے) پاک ہے وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں کیا تم اللہ پر (جھوٹ) کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ (1418)

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ ؕ

کہہ وہ جو اللہ پر جھوٹ بناتے ہیں کامیاب نہیں ہوتے۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ ع

دنیا کا سامان ہے پھر ہماری طرف انہیں لوٹ کر آنا ہے پھر ہم انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ

اور ان پر نوح کی خبر پڑھ، جب اس نے اپنی قوم کو کہا

---

1417 - رات کا آرام انسان کو کام کے قابل بناتا ہے اور دن کی روشنی میں وہ کام کرتا ہے۔ یہ دن اور رات اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں۔ پس نفع نقصان کا مالک وہی ہے جو سامانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یا یہ اشارہ ہے کہ جس طرح رات جسمانی سکون کا موجب ہے اسی طرح روحانی سکون کا موجب بھی ہے۔ کیونکہ رات کی عبادت سے خصوصیت سے تسکین قلب حاصل ہوتی ہے اور ایسا ہی دن جس طرح جسمانی طور پر روشنی دیتا ہے ایسا ہی روحانی طور پر بھی۔

1418 - **شرک اتخاذ ولد:** جب شرک کا ذکر کیا تو اس سب سے بڑے شرک کا بھی ذکر کیا جو دنیا میں پھیل جانے والا تھا اور یہ بھی بتایا کہ اس شرک کی بھی کوئی دلیل ان کے ہاتھ میں نہیں اور [آیت: 70] میں ان کی ظاہری حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کی زندگی کے سامان اگر انہیں بہتات سے ملیں تو یہ عارضی اور چند روزہ بات ہے۔ حقیقی راحت کے سامانوں سے وہ محروم ہیں اس لیے انجام دکھ ہی دکھ ہے۔

يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور میرا اللہ کی آیات سے نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے تو میرا بھروسا اللہ پر ہے سو اپنا کام درست کرلو اور اپنے شریک جمع کرلو۔ پھر تم کو اپنے کام میں شبہ نہ رہے پھر میرے ساتھ (وہ) کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ (1419)

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

پھر اگر تم پھر جاؤ تو میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے رہوں۔

---

1419 - مَقَامَ مصدر بھی ہوسکتا ہے اور قِيَامٌ سے اسم مکان اور اسم زمان بھی اور یہاں مصدر بھی ہوسکتا ہے یعنی مراد یہ ہو کہ میرا تمہارے درمیان ٹھہرنا تمہیں برا معلوم ہوتا ہے اور یا اسم مکان لے کر اس سے ایماء اپنے نفس کی طرف ہوسکتا ہے۔

﴿فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ﴾ [اَجْمَعْتُ كَذَا] اکثر اس موقعہ پر بولا جاتا ہے جہاں جمع سے کسی امر کی طرف اجتماع فکر سے پہنچنا مراد ہو۔ ﴿فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ﴾ [طٰہٰ: 64:20] ''اس لیے اپنی تدبیر کو پختہ کرو۔'' اور [أَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى كَذَا] سے مراد ہے کہ مسلمانوں کی رائیں اس امر پر مجتمع ہوگئیں اور ﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ [آل عمران: 173:3] ''لوگوں نے تمہارے (مقابلے کے) لیے (لشکر) جمع کیے ہیں۔'' میں راؤں کا اجتماع بھی مراد ہوسکتا ہے اور لشکروں کا بھی۔ اور [أَمْرٌ جَامِعٌ] اس عظیم الشان امر کو کہتے ہیں جس کے لیے لوگ اکٹھے ہوجائیں ﴿وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ﴾ [النور: 62:24] ''اور جب کسی بات کے لیے جہاں جمع ہونے کی ضرورت ہے اس کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔'' اور [جَمَعَ اَمْرَهٗ] اور اَجْمَعَهٗ کے معنی ہیں [عَزَمَ عَلَيْهِ] یعنی اس پر عزم کرلیا اور ﴿فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ﴾ میں وَ بمعنی مَعَ ہے یعنی [اَجْمِعُوْٓا أَمْرَكُمْ مَعَ شُرَكَآءِكُمْ] اور بعض نے [وَادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ] مراد لیا ہے۔

﴿غُمَّةً﴾۔ غَمَّ۔ کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں اور [اَمرٌ غُمَّةٌ] اس امر کو کہتے ہیں جو مبہم اور مشکوک ہو۔ (ل)

﴿اقْضُوْٓا اِلَيَّ﴾۔ قَضَآءٌ۔ کسی امر کا فیصلہ کردینا قول سے ہو یا فعل سے اور یہاں قَضَآءٌ فعل سے ہے یعنی اس اپنے فیصلہ کو میرے متعلق عمل میں لے آؤ ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ﴾ [البقرة: 200:2] ''پھر جب تم اپنے حج کے ارکان کو پورا کرلو'' اور ﴿اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ﴾ [القصص: 28:28] ''جونسی مدت میں پوری کروں۔'' میں بھی قضائے فعلی ہی ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

پر انہوں نے اسے جھٹلایا سو ہم نے اسے اور انہیں جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے بچایا اور انہیں جانشین بنایا اور انہیں غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا تو دیکھ لے جو ڈرائے گئے تھے ان کا انجام کیسا ہوا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

پھر ہم نے اس کے بعد اپنی (اپنی) قوم کی طرف رسول بھیجے اور وہ ان کے پاس کھلی دلائل لائے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جسے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ (1420)

---

اعدائے رسول کو چیلنج:

رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کا ذکر تھا۔ اسی میں قرآن کریم کے مومنوں کو مقامات عالیہ پر پہنچانے کا ذکر آیا۔ اب پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے اور مثال کے رنگ میں پہلے انبیاء کی تکذیب اور اس کے نتائج کو پیش کیا ہے۔ مگر اصل ذکر آنحضرت ﷺ کا مقصود ہے اور آپ کے ہی مخالفوں کو ان الفاظ میں خطاب ہے کہ تم جو کچھ طاقت رکھتے ہو میرے خلاف کر گزرو، میری ہلاکت کا عزم کر لو، کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، مہلت بھی نہ دو اور جو کرنا چاہتے ہو فوراً کر گزرو۔ اس شدید مخالفت کے اندر اور کفار کے اس جوش کے اندر جو ان میں پہلے ہی پھیلا ہوا تھا ان الفاظ میں دشمنوں کو یہ کہنا کہ تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے میری مخالفت پر زور لگا لو اور میری تباہی کے سامان کر لو، انسان کا کام نہ ہو سکتا تھا۔ چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں، چند بے بس دوست ہیں، وہ گھروں سے نکل چکے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر کس قدر ایمان ہے کہ یہ پیغام پورے زور کے ساتھ دشمنوں کو پہنچاتے ہیں۔

1420 - ﴿اِلٰى قَوْمِهِمْ﴾ میں بتایا ہے کہ ہر ایک رسول کو ایک خاص قوم کی طرف بھیجا گیا۔ ان رسولوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت بھی عام نہ تھی جیسا کہ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ﴾ [نوح: 1:71] ''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا'' سے ظاہر ہے اور اس کا سارا خطاب اپنی قوم سے ہی پایا جاتا ہے۔ اور جو فرمایا کہ جس بات کو پہلے جھٹلایا اس پر ایمان نہ

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، پر انہوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾

سو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا انہوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔

قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾

موسیٰ نے کہا کیا تم حق کو (یہ) کہتے ہو کہ جب وہ تمہارے پاس آیا، کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس (راہ) سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا اور تم دونوں کے لیے ملک میں بڑائی ہو اور ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں۔[1421]

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾

فرعون نے کہا ہر ایک علم والے جادوگر کو میرے پاس لے آؤ۔

---

لائے تو مطلب یہ ہے کہ ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یکساں سلوک کیا یعنی پہلے ہی بغیر سوچے سمجھے جھٹلا دیا، پھر مخالفت اور تکذیب پر اڑ گئے، کیونکہ دلوں میں نفرت اور بغض بیٹھ گیا۔

1421 - تَلْفِتَ۔ لَفَتَ کے معنی صَرَفَ ہیں یعنی پھیر دیا۔ اسی سے التفات ہے ایک طرف سے ہٹ کر دوسری طرف متوجہ ہونا۔ ان آیات میں سحر اور ساحر دھوکہ اور دھوکہ باز کے معنی میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾

سو جب جادوگر آ گئے موسیٰ نے انہیں کہا ڈالو جو تم ڈالتے ہو۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

تو جب ڈال چکے موسیٰ نے انہیں کہا جو تم لائے ہو یہ دھوکا ہے اللہ اس کو ابھی باطل کر دکھائے گا۔ کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارتا۔

وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع 8 12 13

اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو سچا کر دکھائے گا۔ گو مجرم برا منائیں۔[1422]

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

پھر موسیٰ پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم کے کچھ لوگ فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ انہیں دکھ دے گا اور فرعون یقیناً ملک میں سرکش تھا اور وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا۔[1423]

---

1422 - **موسیٰ علیہ السلام کا غلبہ بذریعہ کلمات:** یہ آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ احقاق حق بذریعہ ان کلمات کے ہوا جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سکھائے تھے اور یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری غلبہ کا موجب ہوئی۔

1423 - ﴿ذُرِّيَّةٌ﴾ ۔ [دیکھو نمبر: 156] اور اس میں باپ، بیٹے، اولاد، عورتیں سب شامل ہیں ﴿اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ﴾ [يٰسٓ: 41:36] ''ہم ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں اٹھاتے ہیں۔'' (ل) اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی جنگ میں ایک عورت کو قتل ہوا دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ جنگ کرنا نہ چاہیے تھا۔ اور پھر آپ ﷺ نے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیجا اور حکم دیا [لَا تَقْتُلَنَّ ذُرِّيَّةً وَلَا عَسِيْفًا] (مسند أحمد، جلد29، صفحہ 151) جہاں ذُرِّيَّةً کی تشریح میں ابن اثیر لکھتے ہیں: [يَجْمَعُ نَسْلَ الْإِنْسَانِ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى] (ن) یعنی ذُرِّيَّةً سے مراد نسل انسان ہے۔ مرد اور عورتیں یہ دونوں اس میں شامل ہیں۔

﴿ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ﴾ میں مراد بعض نے قوم بنی اسرائیل اور بعض نے قوم فرعون لی ہے۔ مگر ترجیح قول اول کو ہے۔ (ج) سیاق

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ۙ

تو انہوں نے کہا اللہ ہی پر ہم بھروسا کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ (1424)

وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر لوگوں سے چھڑا۔

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے

---

عبارت یہی چاہتا ہے۔ کیونکہ آگے ذکر موسیٰ کی قوم کا ہی چلتا ہے اور ذُرِّيَّةٌ سے مراد یہاں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک قلیل ہے یعنی تھوڑے لوگ اور بعض نے اولاد مراد لی ہے۔ یعنی ان کے باپ مدت گزر جانے سے مر چکے تھے اور مَلَاْئِهِمْ میں ضمیر ذُرِّيَّةٌ کی طرف بلحاظ معنی جاتی ہے یا قوم کی طرف۔ یا تو فرعون کی قوم کے سرداروں کو بنی اسرائیل کے سردار کہا ہے اس لیے کہ بنی اسرائیل محکوم تھے اور یا مَلَاْئِهِمْ سے مراد واقعی بنی اسرائیل کے بڑے لوگ ہیں۔ کیونکہ فرعون انہی لوگوں کے ذریعہ سے بنی اسرائیل پر ظلم کرتا تھا۔ جیسا کہ دوسری جگہ قارون کا ذکر صاف الفاظ میں ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ خود غرض لوگ اپنے ذاتی رسوخ اور مالی فائدہ کے لیے اپنی ہی قوم کی جڑیں کاٹنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ جیسے آج کل بھی بہتیرے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کوئی عہدہ ان کو حکومت میں ملتا ہے یا کسی عزت کی خواہش ہوتی ہے تو اپنی ہی قوم کی بیخ کنی کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں۔ پس مراد یہ کہ بنی اسرائیل میں سے بھی بہت سے لوگ فرعون اور اپنے نمبرداروں کے خوف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے اور یہ ابتدا کا ذکر ہے اور یہاں قوم فرعون کا ذکر نہیں۔ گو ان میں سے بھی چند ایک لوگ جیسے خود ساحر اور رجل مومن مذکورہ سورۃ المومن حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔

1424 - فِتْنَةً کے اصل معنی دکھ اور عذاب ہیں اور یہاں مراد فتنہ کا محل ہے۔ گویا اس عذاب اور تکلیف سے نجات مانگی ہے جو فرعون کی طرف سے ان کو پہنچتا تھا۔

بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

گھروں کو مسجدیں بناؤ اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو خوشخبری دے۔ (1425)

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا

اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں آسائش کا سامان اور بہت سا مال دے رکھا ہے، اے ہمارے رب اس لیے کہ وہ تیرے رستہ سے بہکائیں، اے ہمارے رب ان کے مالوں کو برباد کردے اور ان کے دلوں کو سخت کردے سو وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ

---

1425 - قِبْلَةً سے مراد یہاں مجازاً نماز کی جگہ یا مسجد ہے جیسے دوسری جگہ مصلیٰ یا نماز کی جگہ سے مراد قبلہ ہے۔[دیکھو نمبر: 158]

**بنی اسرائیل کی نجات کا سامان:**

بنی اسرائیل مصر میں تو رہتے ہی تھے اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ وحی کرنے کا کیا مطلب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنی قوم کو فرعون کے پنجہ سے چھڑالاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا مطالبہ فرعون سے یہی تھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو ﴿فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾[الأعراف: 105:7] ''سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔'' لیکن فرعون نے اس کی اجازت نہ دی اور اپنے شدائد اور مظالم کو بنی اسرائیل پر اور سخت کیا اور چونکہ خود بنی اسرائیل بھی عرصہ دراز تک محکومیت کی حالت میں رہنے سے ان اخلاق فاضلہ سے عاری ہو چکے تھے جن سے قوم کو بادشاہت مل سکتی ہے اس لیے حکم ہوا کہ ابھی کچھ مدت ملک مصر میں رہنا ہوگا۔ مگر یہ تمہارا رہنا بے کار نہ ہو بلکہ انہی گھروں کو مسجدیں بناؤ اور اللہ تعالیٰ سے دعا میں لگ جاؤ اور نماز کو قائم کرو تا کہ تمہارے اندر اخلاق فاضلہ پیدا ہوں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ﴾[الأعراف: 128:7] ''اللہ سے مدد مانگو۔'' یہی ان کی مشکلات کا علاج تھا۔ قوموں کے اندر جب ان کی حالت گر چکی ہو اخلاق فاضلہ کا پیدا کرنا آسان امر نہیں ہوتا، ایک عرصہ دراز کو چاہتا ہے۔ آج مسلمان اس صریح تعلیم قرآنی کی پروا تک نہیں کرتے اور حکومت اور بادشاہت کو اپنا پہلا اور آخری نصب العین بنا کر راہِ صواب سے ادھر اُدھر بھٹک رہے ہیں اور اپنی قوم کی اصلاح اس طریق سے کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جس طریق سے ایسے ہی حالات کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی اصلاح کا حکم دیا تھا۔

| | |
|---|---|
| الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ | دردناک عذاب دیکھیں۔ (1426) |
| قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ | فرمایا تم دونوں کی دعا قبول ہوئی سو تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے رستہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ |
| وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ | اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کر دیا، پھر فرعون اور اس کے لشکروں نے شرارت اور زیادتی سے ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا کہا میں مانتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے |

---

**ہارونؑ کو وحی:**

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کو ہوتی تھی اور یہاں ذکر بھی دو باتوں کا ہے۔ ایک مصر میں اقامت کرانے کا دوسرا نماز کا اور نماز کی امامت کا کام حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد تھا۔

1426 - ﴿لِيُضِلُّوْا﴾ میں لام عاقبت کا ہے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مال اس لیے دیا تھا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ بلکہ مال دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا۔

﴿اشْدُدْ﴾۔ شَدَّ کے معنی مضبوط باندھنا ہیں ﴿وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ﴾ [الدهر: 28:76] ''اور ان کی بناوٹ کو مضبوط بنایا۔'' ﴿فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ [محمد: 4:47] ''تو قید میں مضبوط باندھ لو۔'' (غ) اور [شَدَّ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں [حَمَلَ عَلَيْهِ] اس پر حملہ کیا۔ (ن)

**حضرت موسیٰؑ کی دعا فرعون کی تباہی کے لیے:**

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا اس وقت کی ہے جب فرعون کے سامنے ہر قسم کے نشان اور دلائل دیئے جا چکے ہیں اور بار بار نشان دیکھ کر اور ایمان لانے کا وعدہ کر کے وہ اس سے انحراف کر چکا ہے اور بنی اسرائیل پر سختی کو اور بڑھا دیا ہے ﴿لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ﴾ [الأعراف: 134:7] ''اگر تو ہم سے عذاب اٹھا دے ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے۔'' جب چھوٹی چھوٹی تکالیف سے انسان اپنی اصلاح نہیں کرتا تو پھر بڑی تکالیف اس پر آتی ہیں۔ اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ

بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ (1427)

آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

کیا اب (ایمان لاتا ہے) اور پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع 9 10 14

سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیں گے تاکہ تو ان کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان ہو اور یقیناً بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں۔ (1428)

---

میں اشارہ ہے۔ فرعون کو جس چیز نے روکا وہ مال ہے۔ اس لیے اس کی تباہی کی دعا کی۔ گویا جس مال نے حق سے روکا تھا وہ بھی باقی نہ رہے ﴿وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ کے معنی عموماً مفسرین نے یوں کیے ہیں کہ ان کے دلوں پر مہر کر دے یا ان کے دلوں کو سخت کر دے۔ مگر شد کا صلہ علیٰ ہو تو اس کے معنی حملہ کرنے کے لغت میں آئے ہیں اور دلوں پر حملہ کرنے سے مراد دلوں کی محبوب چیزوں کو الگ کر دینا ہے۔ گویا وہ چیزیں جن کی محبت نے انہیں حق سے پھیرا ہے ان سے چھین لی جائیں اور اگر دلوں کو سخت کرنے کے معنی ہی لیے جائیں تو یہ دعا چونکہ ان کی سزا کے لیے ہے اس لیے ایسے اعدائے حق کے لیے ایسی دعا بھی قابل اعتراض نہیں، گو اس میں سختی کا پہلو غالب ہے۔

1427 - **فرعون کی توبہ** یا مرتے وقت ایمان لانے کا ذکر بائبل میں نہیں مگر قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کو ایک دوسرے امر کے ساتھ وابستہ کیا ہے یعنی اس کی لاش کے باہر پھینکنے سے، دیکھو اگلی سے اگلی آیت۔ اس کا ذکر بھی کسی تاریخ میں نہیں۔ مگر آج واقعات نے اس کو صحیح ثابت کر کے اس دوسرے امر کی صداقت پر بھی مہر لگا دی اور یوں بتا دیا کہ قرآن کریم بائبل سے نہیں لیتا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ گو بائبل میں یہ ذکر نہیں مگر طالمود میں [خروج 16:9] کی تفسیر کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ فرعون نے توبہ کی تھی۔

1428 - **فرعون کی لاش اور قرآن کریم کا معجزہ:** ﴿نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ﴾ نجات کے ساتھ بدن کے لفظ کو اس لیے بڑھایا تاکہ معلوم ہو کہ یہ لاش بلا روح تھی۔ (ج)

قرآن کریم کی صداقت کے عظیم نشانوں میں سے یہ ایک نشان ہے کہ اس بات کا پتہ دیا جس کا اس زمانہ میں کسی کو علم تک بھی نہ تھا۔ لیکن آج واقعات اسے صحیح ثابت کرتے ہیں بلکہ اس کی صحت کا ایسا پختہ ثبوت ملتا ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ نہ بائبل میں نہ اور کسی کتاب میں فرعون کی لاش کو باہر پھینکنے کا ذکر ہے۔ مگر قرآن کریم نے یہ ذکر ایسے کھلے الفاظ میں کیا ہے کہ ان الفاظ کے یہی معنی تمام مفسرین کرتے آئے ہیں کہ فرعون کی لاش کو اللہ تعالیٰ نے سمندر سے باہر نکال پھینکا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو صدق کے مقام میں ٹھہرایا اور ان کو ستھری چیزوں سے رزق دیا تو انہوں نے اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس علم آیا، تیرا رب قیامت کے دن ان میں فیصلہ کرے گا جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ (1429)

---

مقابل میں جو فرعون تھا اس کا نام تاریخ سے رعمیسس ثانی ثابت ہے اور انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا میں مضمون ممّی کے نیچے لکھا ہے کہ رعمیسس ثانی کی لاش آج تک ان لاشوں میں محفوظ ہے جو مسالہ وغیرہ کے ذریعہ سے رکھی جاتی ہیں۔ آج ان الفاظ ﴿لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً﴾ کی شوکت کے سامنے دنیا کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے کہ یہ کلام صرف خدائے عالم الغیب کا ہوسکتا تھا۔ آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک عرب کے اُمّی کی زبان سے ایک بات کا اظہار کرایا جاتا ہے جس سے دنیا بے خبر تھی اور آج واقعات اسے صحیح ثابت کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے آیات اللہ سے بے خبر ہونے میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ تک بے خبر رہنے کے بعد دنیا کو یہ پتہ ملے گا۔ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس قسم کا بین ثبوت خدائے عالم الغیب کی طرف سے ہونے کا پیش نہیں کرسکتی۔

1429 - ﴿مُبَوَّاَ صِدْقٍ﴾ مُبَوَّاَ۔ بَوَّاءَ سے مکان کے معنی میں ہے اور صِدْقٍ کے مقام سے مراد اچھا مقام ہے۔ [دیکھو نمبر: 1371] اور خلیل کا قول ہے کہ ہر کامل چیز کو صدق کہا جاتا ہے اور ﴿مُبَوَّاَ صِدْقٍ﴾ کے معنی کیے ہیں منزل صالح۔ (ت) یعنی ایسا مقام جو ہر طرح کی صلاحیت رکھتا ہے۔

## بنی اسرائیل پر نعمت اور ان کی مخالفت رسول:

آیت کے پہلے حصہ میں یہ ذکر ہے کہ فرعون کے ہاتھ سے نجات دلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مقام صدق عطا فرمایا اور مقام یا جگہ کا کمال یہ ہے کہ اس میں رہنے والوں کو ہر طرح کے فوائد حاصل ہوں اور وہ اچھی سے اچھی جگہ اور اعلیٰ مقام ہو اور یہاں اشارہ ارض مقدس کی طرف ہے جہاں نہ صرف وہ دوسری قوم کی غلامی سے آزاد تھے بلکہ ان کو عمدہ سے عمدہ چیزیں بھی وہاں میسر تھیں۔ اور طیبات کے رزق میں بادشاہت بھی شامل ہے اور علوم بھی جو بذریعہ انبیاء علیہم السلام ان کو دیئے گئے اور دوسری جگہ ان کی تصریح یوں فرمائی ہے: ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾﴾ [المآئدۃ: 20:5] ''اللہ کی نعمت (جو) تم پر (ہوگی) یاد کرو جب اس نے تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو قوموں میں سے کسی کو نہیں دیا۔'' کیونکہ رزق کا لفظ وسیع ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا انعام تھا۔ دوسرے حصہ آیت میں ان کی موجودہ حالت کا ذکر کیا جب باوجود علم کے انہوں نے اختلاف کیا اور اختلاف سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾

(اے سننے والے) اگر تجھے اس میں شک ہے جو ہم نے تیری طرف اتارا تو ان لوگوں سے پوچھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔ یقیناً تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا ہے۔ پس تو جھگڑا کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ (1430)

وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾

اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ورنہ تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

---

اختلاف یا آپ کی مخالفت ہے [دیکھو نمبر: 214]۔

1430 - ﴿شَكٍّ﴾۔ کسی شخص کے نزدیک دو امور کا جو ایک دوسرے کے نقیض ہیں یکساں اور مساوی ہونا شک ہے اور یہ یا اس لیے ہوتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک دونوں میں یکساں نشانات پائے جاتے ہیں یا دونوں میں یکساں نشان نہیں پائے جاتے۔ اور شک کبھی تو کسی شے کے متعلق ہوتا ہے کہ وہ موجود ہے یا نہیں اور کبھی اس کی جنس کے متعلق ہوتا ہے کہ یہ کس جنس میں سے ہے اور کبھی اس کی بعض صفات میں ہوتا ہے اور کبھی اس غرض میں ہوتا ہے جس کے لیے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہو اور شک ایک قسم کی جہالت ہے مگر جہالت عام ہے اور یہ خاص اور ہر شک جہالت ہے گو جہالت شک نہیں۔ (غ)

### آنحضرت ﷺ کو قرآن کریم کے متعلق کبھی شک نہ تھا نہ ہوسکتا تھا:

یہاں خطاب کس سے ہے؟ یہ ایک ایسا بین امر ہے کہ جس پر چنداں بحث کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں بسا اوقات خطاب عام ہوتا ہے گو مخاطب واحد ہو اور ہر مخاطب واحد نبی ﷺ نہیں۔ بلکہ بعض جگہ نبی کے نام سے بھی خطاب ہو تو مراد عام ہوتی ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ [الطلاق: 1:65] ''اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو'' یہاں ایسے مخاطب کا ذکر ہے جس کو قرآن کے بارے میں شک ہے اور شک کے معنی اوپر بیان ہو چکے کہ دو نقیض باتوں میں مساوات اور اعتدال۔ مثلاً شک اس شخص کو ہوگا جو فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے یا افترا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نبی ﷺ کو ایسا خیال ہونا قطعی طور پر ناممکن ہے یہاں تک کہ بڑے بڑے مخالفین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے آپ کو سچائی پر یقین کرتے تھے اور مکی زمانہ کے متعلق جب کی یہ سورت ہے بالخصوص یہ اعتراف اکثر عیسائیوں کو ہے۔ پھر قرآن کے بارہ میں آپ کو شک ہونا بالکل بے معنی بات ہے۔ اگر نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ آپ افترا کر رہے تھے تو بھی آپ کو علم تھا کہ میں افترا

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾

وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات پوری ہوگئی، ایمان نہیں لائیں گے۔

---

کررہا ہوں اور اگر افترا نہیں کررہے تھے تو بھی علم تھا کہ میں افترا نہیں کررہا ہوں۔ قرآن کے متعلق کسی دوسرے کو شک ہوسکتا ہے خود رسول اللہ ﷺ کو دونوں صورتوں میں شک نہیں ہوسکتا۔ یعنی خواہ دشمن سچے ہوں یا جھوٹے آپ کو شک کبھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ شک جہالت کا نام ہے اور آپ کو علم ہے کہ یہ کیا ہے۔ شک کا لفظ انہی لوگوں کے متعلق ہوسکتا ہے جو ایک درمیانی اور تذبذب کی حالت میں ہیں۔ نہیں جانتے کہ اسے سچا کہیں نہ یہ کہ اسے جھوٹا کہیں، کبھی ایک بات کہتے ہیں کبھی دوسری۔ پھر جس شخص کے اندر اس قدر قوت یقین بھری ہوئی ہو کہ سینکڑوں دلوں کے اندر ایسا یقین پیدا کردے کہ وہ موت کے منہ میں جانا قبول کرلیں گے مگر قرآن کو نہ چھوڑیں گے، کیا اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس کو شک ہو۔ اور اس سے اگلی آیت نے یہ بالکل واضح کردیا کیونکہ وہاں فرمایا کہ تو جھٹلانے والوں میں سے نہ ہو۔ یہاں بھی خطاب واحد ہے اگر شک کرنے والے نعوذ باللہ نبی ﷺ ہیں تو جھٹلانے والے بھی وہی ہوں گے جو ایک ایسی بدیہی باطل بات ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل بکار نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ صفائی سے آیت [104] میں فرمایا ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ وہی لوگ جن کو یہاں بصیغہ واحد خطاب کیا ہے وہاں بصیغہ جمع خطاب کرکے بات کو صاف کردیا ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے اور اسی آیت کے آخر پر ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں۔ پس آپ ہی شک کرنے والے کس طرح ہوسکتے ہیں۔ اور ﴿مِمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ﴾ اس کے خلاف نہیں کیونکہ قرآن شریف میں بار بار قرآن کریم کے سب کی طرف نزول کا ذکر ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝﴾ [النسآء: 174:4] ''اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف واضح کردینے والا نور نازل کیا ہے۔''

اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔

بعض مفسرین نے غلطی سے ﴿فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ میں **عبداللہ بن سلام** رضی اللہ عنہ کا ذکر کردیا ہے۔ حالانکہ وہ مدینہ میں ایمان لائے اور یہ سورت مکی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر ایمان لائے تھے نہ کہ رسول اللہ ﷺ ان سے دریافت کرکے اپنی صداقت پر ایمان لائے تھے۔ اور یہ غلطی خود اس سے ظاہر ہے کہ ابن جریر میں کئی روایتیں موجود ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نہ کبھی شک کیا اور نہ سوال کیا بلکہ بعض روایتوں میں یہ لفظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [لَا أَشُكُّ وَلَا أَسْأَل] (مصنف عبدالرزاق، جلد6، صفحہ125، حدیث:10211) نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ سوال کرتا ہوں۔ جس میں صاف طور پر یہ سمجھا دیا کہ میرے متعلق یہ آیت نہیں بلکہ اس میں خطاب دوسرے لوگوں سے ہے اور یہ امر واقعات تاریخی میں سے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی کسی اہل کتاب سے کسی امر کے متعلق اس غرض سے سوال نہیں کیا کہ وہ کسی حقیقت کو آپ پر منکشف کردے گا۔

وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

اور گو اُن کے پاس سب نشان آ جائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھیں۔ (1431)

فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

تو کیوں کوئی بستی ایسی نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا، مگر یونس کی قوم، جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا اور ایک وقت تک ان کو سامان دیا۔ (1432)

---

1431 - اللہ تعالیٰ کا وہ کون سا کلام تھا جو ایسے لوگوں کے حق میں پورا ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہی سزائے تکذیب ہے جس کا ذکر چل رہا ہے اور پچھلی آیت میں اس تکذیب کا ذکر پھر بھی کر دیا ہے۔

1432 - ﴿يُوْنُس﴾۔ بائبل میں یہ نام یوناہ ہے اور ان کی ایک مختصر سی کتاب بائبل کے مجموعہ کتب انبیاء میں موجود ہے۔ ان کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح ہے۔ قرآن کریم میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر علاوہ اس مقام کے [الأنعام: 86:6]، [الأنبیآء: 87:21]، [الصافات: 39:37 تا148]، [القلم: 48:68 تا50] میں ہے۔ ان کا پیغام اہل نینوہ کی طرف تھا اور نینوا اس زمانہ میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کا دارالخلافہ تھا جو دنیا کے بڑے حصہ پر محیط تھی۔

**اہل نینوہ اور عذاب:**

جہاں انبیاء کے مکذبین کی ہلاکت اور تباہی کا ذکر کیا ایک ایسے نبی کا بھی ذکر کر دیا جس کے مخالفین باوجود نہ ماننے کے آخر توبہ کر کے عذاب الٰہی سے بچ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ ابن کثیر میں ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اہل نینوہ کو عذاب سے ڈرایا مگر انہوں نے نہ مانا۔ تب یونس علیہ السلام ان کے درمیان سے چلے گئے (تاکہ عذاب کے مقام سے الگ ہو جائیں) تب ان لوگوں نے ۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ نے وہ عذاب دور کر دیا۔ پھر دو گروہ ہیں۔ ایک کہتے ہیں کہ ان سے صرف عذاب دنیا دور کیا گیا اور عذاب اخروی نہیں (گویا فی الواقع وہ ایمان نہ لائے تھے صرف عذاب کے خوف سے کچھ رجوع کیا) اور دوسرے کہتے ہیں کہ عذاب اخروی بھی ان سے دور کیا گیا اور وہ ایمان لے آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ **انذاری پیشگوئیاں ٹل بھی جاتی ہیں**۔ حالانکہ ایک نبی کی زبان سے وہ ظاہر بھی کر دی گئی ہوں اور گو رجوع کامل ہو جس میں ایمان صحیح ہو یا ناقص ہو کہ صرف عذاب کے خوف سے رجوع کیا جائے۔

حضرت یونس علیہ السلام کے اس ذکر میں جو خصوصیت سے مکذبین کے انجام میں لایا گیا ہے یہ اشارہ ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آخر رجوع کریں گے اور وہ تباہ نہ کیے جائیں گے۔ اسی مخالفین پر رحم کیا جانے کی طرف ہی اشارہ اس حدیث میں معلوم ہوتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [لَا تُفَضِّلُوْنِيْ عَلٰى يُوْنُسَ] (جامع الاصول فی احادیث الرسول، جلد8، صفحہ 526)

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا تُو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔ (1433)

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور کسی شخص کے لیے نہیں کہ سوائے اللہ کے اذن کے ایمان لائے اور وہ پلیدی کو انہی پر ڈالتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (1434)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

کہہ دیکھ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور نشان اور ڈرانے والے ان لوگوں کے کچھ کام نہیں آتے جو ایمان نہیں لاتے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ تو صرف ایسے ہی دنوں کا انتظار کرتے ہیں جیسے ان پر آئے جو ان سے پہلے گزر چکے، کہہ انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (1435)

---

''مجھے یونس پر فضیلت مت دو۔''

1433 - یہ تو مکی زمانہ ہے اس لیے یہ شک پیدا نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ ﷺ تلوار سے لوگوں کو مسلمان کرنا چاہتے تھے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ تو خوشی کا ہے اس لیے جو ایمان لاتے ہیں لائیں۔

1434 - اِذْنِ سے کیا مراد ہے؟ [دیکھو نمبر: 123]۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے اذن سے ہی ہوتا ہے ﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: 145:3] ''اور کسی شخص کے لیے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے سوا مر جائے۔'' مگر فرمایا کہ کفر کی پلیدی اور ناپاکی انہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سو جب ایک انسان عقل سے کام نہ لے تو اللہ کا اذن بھی اس کے متعلق نہ ہوگا۔

1435 - اَيَّامِ کے لیے [دیکھو نمبر: 524]۔ مراد واقعات ہیں جو پہلوں پر گزرے یعنی جیسے مصائب ان پر آئے یہاں فرمایا کہ یہ ایام بھی آئیں گے، انتظار کرو۔ اگلی آیت میں رسول اور مومنوں کے نجات پا جانے کو پھر بطور پیشگوئی واضح الفاظ میں بیان فرمایا۔

ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع 10 11 15

پھر ہم اپنے رسولوں کو اور انہیں جو ایمان لائے بچاتے ہیں اسی طرح، ہمارا ذمہ ہے ہم مومنوں کو بچائیں گے۔ (1436)

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۖۗ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ۙ

کہہ اے لوگو! اگر تمہیں میرے دین میں شک ہے تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کو تم اللہ کے سوائے پوجتے ہو۔ لیکن میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں۔ (1437)

وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور یہ کہ یکسو ہو کر اپنے تئیں دین پر قائم رکھ اور مشرکوں میں سے مت ہو۔ (1438)

---

1436 - **اعدائے دین کے ظلم سے نجات:** جب پچھلی آیت میں عذاب کے انتظار کے لیے کہا تو اب بتایا کہ جب عذاب آتا ہے تو رسول اور اس کے ساتھ مومن نجات پا جاتے ہیں یعنی دشمنوں کے ظلم سے رہائی حاصل کر لیتے ہیں۔ تو اس میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی دی اور دوبارہ فرمایا اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیں گے۔ یعنی اعدائے دین کے ظلم سے چھڑانا صرف رسول سے مخصوص نہیں بلکہ جب کبھی مومنوں پر مصائب آئیں گی تو اسی طرح ہم ان کو بھی نجات دیتے رہیں گے بلکہ درمیان میں ﴿حَقًّا عَلَیْنَا﴾ لا کر اسے اور بھی موکد کیا ہے۔ اس قدر تاکید کے باوجود آج کس طرح مسلمان ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں مصائب میں گرفتار ہیں۔ مگر کیوں؟ اس لیے کہ مومن نہیں بنتے۔ اگر مسلمان سچے دل سے مومن بن جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مصائب کو خود دور فرما دے۔

1437 - اللہ تعالیٰ کی توحید کے مضمون کو قرآن شریف نے بار بار دہرایا ہے۔ اس صراحت کے ہوتے ہوئے کسی کو آپ کے دین میں کیا شک ہو سکتا تھا۔ بایں پھر وضاحت کر دی جن کی تم عبادت کرتے ہو اس کی میں عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے۔ اس خاص صفت کے اختیار کرنے میں ایک تو یہ اشارہ ہے کہ جن انسانوں کو تم نے خدا یا خدا کی طرح سمجھا ہوا ہے وہ بھی آخر مرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ تمہارا کوئی معبود تمہیں موت سے نہیں بچا سکتا۔

1438 - اس آیت میں خطاب پھر بدل گیا ہے۔ اوپر کی آیت میں تھا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں اور یہاں ہے کہ تو اپنی توجہ کو دین کے لیے مضبوط رکھ اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرا مخاطب مراد ہے۔ اگلی آیت اور

وَ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَ لَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

اور اللہ کے سوا اسے نہ پکار جو نہ تجھے نفع دیتا ہے اور نہ تجھے نقصان دیتا ہے اور اگر (ایسا) کیا تو تُو بھی اس وقت ظالموں میں سے ہوگا۔

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کے دور کرنے والا کوئی نہیں اور اگر وہ کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو روکنے والا کوئی نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے پہنچاتا ہے اور وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾

کہہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا سو جو کوئی راہ پر چلتا ہے وہ اپنے بھلے کو ہی راہ پر چلتا ہے اور جو کوئی گمراہ ہوتا ہے اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے اور میں تم پر مختار نہیں۔

وَ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع 11 6 16

اور اس کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کر یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔(1439)

---

بھی اس کی وضاحت کرتی ہے۔[آیت: 107] تک یہی عام خطاب ہے۔اسی لیے[آیت: 108] میں پھر دوبارہ فرمایا: قُلْ۔

1439 - اس رکوع میں مومنوں اور کافروں کو الگ کر کے آخر پر فرمایا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی وحی کی پیروی کیے جاؤ۔مشکلات سے اللہ تعالیٰ خود باہر نکالے گا اور دونوں گروہوں میں فیصلہ کر کے دکھا دے گا کہ حق پر کون ہے۔ایسی صریح آیات کا جن میں حق کی آخری کامیابی کو روز روشن کی طرح ظاہر کیا گیا ہے یہ اثر تھا کہ جب کفار کی مخالفت فتح مکہ کے ساتھ ٹوٹ گئی تو گروہوں کے گروہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے۔

# سورہ ھود

## نام:

اس سورۃ کا نام **هُوْدٍ** ہے اور اس میں 10 رکوع اور 123 آیتیں ہیں گو اس میں حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا بھی ذکر ہے مگر اس کا نام **هُوْدٍ** اس خصوصیت کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام پہلے نبی ہیں جو عرب میں ہوئے۔

## خلاصہ مضمون:

یہ سورت پچھلی سورت سے ملتی جلتی ہے اور یہ دونوں ایک ہی مضمون کی تکمیل کرتی ہی۔ مگر یہاں زیادہ تر مثالوں سے مطلب کو واضح کیا ہے۔

① پہلے رکوع میں حق اور اس کے مخالفین کا ذکر ہے۔

② دوسرے میں بتایا کہ بعض لوگ صرف دنیا کی طلب میں لگ جاتے ہیں اور اس کے مقابل پر طالبان حق کا ذکر کیا۔

③,④ تیسرے اور چوتھے رکوع میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے،

⑤ پانچویں میں حضرت ھود علیہ السلام کا،

⑥ چھٹے میں حضرت صالح علیہ السلام کا،

⑦ ساتویں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کا،

⑧ آٹھویں میں حضرت شعیب علیہ السلام کا،

⑨ نویں میں شقی اور سعید دونوں گروہوں کا الگ الگ ذکر کیا اور ان کا انجام بتایا اور

⑩ دسویں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو عظیم الشان مصائب میں تسلی دی۔

## تعلق:

یہ سورتیں یعنی یونس سے لے کر النحل تک قریباً ایک ہی مضمون پر ہیں۔ یعنی صداقت وحی پر۔ پچھلی سورت میں زیادہ تر علمی بحث تھی اس میں گزشتہ انبیاء اور ان کے مخالفین کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔

## زمانہ نزول

زمانہ نزول اس سورت کا وہی ہے جو سورت یونس کا ہے۔ اس بات سے کہ یہاں دس سورتوں کے مقابل میں لانے کی تحدی ہے اور سورہ یونس میں ایک سورت کی، جو اس میں ترقی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورہ ہود بلحاظ نزول سورہ یونس سے پہلے کی ہے۔

# اٰيَاتُهَا 123 (11) سُوْرَةُ هُوْدٍ مَّكِّيَّةٌ (52) رُكُوْعَاتُهَا 10

| | |
|---|---|
| بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے |
| الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ ﴿١﴾ | میں اللہ دیکھتا ہوں، یہ کتاب جس کی آیتیں پُرحکمت بنائی گئی ہیں پھر کھول کر بیان کی گئی ہیں حکمت والے خبردار (خدا) کی طرف سے ہے۔(1440) |
| اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۙ ﴿٢﴾ | کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ |
| وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ | اور کہ اپنے رب کی بخشش مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تمہیں ایک وقت مقرر تک اچھے سامان سے فائدہ |

1440 - ﴿اُحْكِمَتْ﴾۔ اَحكَمَ اور حَكَمَ کے ایک معنی آتے ہیں [مَنَعَهٗ عَنِ الْفَسَادِ] یعنی اسے بگڑنے سے محفوظ کیا۔ اور اس لیے یہاں ایک معنی کیے گئے ہیں باطل سے اسے محفوظ کیا اور [اَحْكَمَ الْاَمْرَ] کے معنی ہیں اَتقَنَهٗ یعنی اسے مضبوط کیا اور [اَحكَمَتْهُ التَّجَارِبُ] کے معنی ہیں تجربوں نے اسے حکیم یعنی صاحب حکمت بنا دیا۔ (ل) اسی آخری معنی میں لفظ اُحْكِم کا استعمال یہاں معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ ﴿اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ کے مقابلہ پر اللہ تعالیٰ کا اسم حکیم اور فصلت کے مقابلہ پر خبیر لایا گیا ہے۔

## قرآن میں اصول وفروع کا ضروری علم:

پچھلی سورت میں صرف الکتاب الحکیم فرمایا تھا، یہاں تفصیل آیات شاید اس اشارہ کے لیے بڑھایا ہو کہ اس سورۃ میں اسی مضمون کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور احکام سے اصل مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف سارا پرحکمت کلام ہے اور اس کی بنیاد علم پر ہے اور دوسری طرف اس میں تمام تفصیلات ضروری موجود ہیں۔ ضروریات انسانی کا کوئی پہلو نہیں جس پر اس میں بحث نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [النحل: 89:16] ''ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔'' گویا اس کے اصول بھی کامل ہیں اور فروع بھی۔

مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳

پہنچائے گا اور ہر ایک بزرگی والے پر اپنا فضل کرے گا۔ اور اگر تم پھر جاؤ تو میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (1441)

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴

اللہ کی طرف ہی تم سب کو لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۵

سنو یہ اپنے سینوں کو دہرا کرتے ہیں تاکہ اس سے چھپے رہیں۔ سنو جب یہ اپنے کپڑے لپیٹ لیتے ہیں وہ جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ (1442)

---

1441 - پہلے حصہ میں بیان فرمایا کہ اگر تم گناہوں سے استغفار کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرو تو اس سے تمہاری دنیا بگڑ نہیں جاتی بلکہ اس زندگی میں بھی اچھا سامان ملتا ہے اور دوسرے حصہ میں ذِیْ فَضْلٍ سے مراد عمل صالح میں زیادتی والا ہے اور فَضْلَهٗ میں ضمیر یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل عظیم سے اسے دیتا ہے اور یا ضمیر اسی ذی فضل کی طرف ہے اور مراد اس کے فضل یعنی عمل صالح کی جزا ہے۔

1442 - ﴿يَثْنُوْنَ﴾۔ [ثَنَى الشَّيْءَ] کے معنی ہیں اس کے ایک حصہ کو دوسرے پر لوٹایا یا تہہ کیا اور مروڑا بھی اس کے معنی آتے ہیں اور ﴿يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ﴾ کے معنی ہیں کہ محبت ظاہر کرتے ہیں اور سینوں میں بغض چھپاتے ہیں۔ (ل) اور مجاہد نے مراد شک اور امترا لیا ہے۔ (ج) اور یا اس سے مراد حق سے اعراض ہے کیونکہ جو شخص ایک چیز کو لیتا ہے اس کا سینہ اس کے سامنے ہوتا ہے اور جو اعراض کرتا ہے وہ اس سے پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ (ر)

﴿لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ﴾ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اپنی اس عداوت کو جو حق سے رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ سے چھپانا چاہتے ہیں۔

﴿حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ﴾ کے معنی ہیں کپڑوں کو لپیٹتے ہیں اور مراد اس سے یا تو یہ ہے کہ اپنے کانوں پر لپیٹ لیتے ہیں۔

گویا سننے سے اعراض کرتے ہیں اور یا یہ دوڑ جانے سے کنایہ ہے جس طرح [شَمَّرَ ذَيْلًا] اور [اَلْقٰى ثَوْبَهٗ] دوڑنے سے کنایہ ہے۔(غ) ﴿وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ﴾ [نوح: 7:71] ''اور جب کبھی میں نے انہیں بلایا کہ تو انہیں بخش دے انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے۔'' میں یہی دو معنی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ جو اس سے مراد لی گئی ہے کہ سونے کے وقت کپڑے اوڑھ لیتے ہیں۔(ر) تو یہ معنی اس موقعہ پر چسپاں نہیں اور یا مراد صرف چھپنا ہے۔